حضرت مجدد الف ثانیؒ

کے

سیاسی مکتوبات



آباد شاہ پوری



مکتبہ چراغِ اسلام۔ اردو بازار۔ لاہور

حضرت مجددِ الفِ ثانیؒ

کے

سیاسی مکتوبات

آباد شاہ پوری

مکتبۂ چراغِ اسلام ۔ ۴۰۔بی اُردو بازار لاہور

طابع : محمد حنیف
ناشر مکتبہ چراغ اسلام ۔ اُردو بازار ۔ لاہور
مطبع زینتہ پریس ۔ چوک گوالمنڈی ۔ لاہور
اشاعت بار اوّل ستمبر ۱۹۷۷ء
قیمت ۹ روپے

فہرستِ مضامین

۴۔ شخصیات ۱۳۳

دیباچہ

حضرتِ مجدّد والف ثانی رح کی دعوتی زندگی کے سیاسی پہلو پر یہ کتاب مختلف مرحلوں میں مکمل ہوئی ہے۔ پہلے خیال یہ تھا کہ اس پہلو سے متعلق مکاتیب کا مجموعہ مرتّب کر کے اس پر ایک مختصر سا تبصرہ لکھ دیا جائے؛ چنانچہ انہی خطوط پر کام شروع کیا گیا۔ خطوط مرتّب کر کے مقالہ لکھنے کی نوبت آئی، تو محسوس ہُوا کہ موضوع کی اہمیّت کے لحاظ سے ایک مختصر سا مقالہ ناکافی اور تشنہ رہے گا؛ چنانچہ مفصّل مقالہ لکھنے کا فیصلہ کیا اور خطوط میں بھی اضافہ کیا۔ اس طرح سے حضرت مجدّدؒ کے سیاسی کام پر ایک چھوٹی سی کتاب مرتب ہو گئی ہے۔

مقالہ قلمبند کرتے وقت ہم نے زیادہ تر مُلّا عبدالقادر بدایونی کی کتاب "منتخب التواریخ" پر انحصار کیا ہے۔ اکبر کے فتنۂ دینِ الٰہی پر یہی کتاب مفصّل روشنی ڈالتی ہے۔ اس کے مصنف خود دربارِ اکبری میں موجود تھے، انہوں نے اس فتنے کو سر اٹھاتے، پروان چڑھتے اور حکومت اور معاشرے پر اپنے نقوش ثبت کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ خود ان محفلوں میں شریک رہے تھے، جن میں اس فتنے نے جنم لیا۔ جو لوگ اس فتنہ سامانی کا باعث ہوئے اور جنہوں نے اسے باقاعدہ فکری و علمی غذا فراہم کی، ان کے کردار سے بھی وہ براہِ راست واقف تھے۔ بنابریں ان کا بیان ایک عینی گواہ کا بیان ہے۔ تاہم بعض "محققین" بدایونی کو مبالغہ آرائی کا مرتکب گردانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بدایونی کی بیان کردہ تفصیلات اس دور کی کسی اور تاریخ میں نہیں ملتیں۔ چند اور محققین مُلّا صاحب کو حاسد و متعصّب اور ان کی کتاب "منتخب التواریخ" کو حسد و تعصّب کا کرشمہ قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مُلّا صاحب تنگ دل اور تنگ نظر انسان تھے مزید یہ کہ وہ

دربار میں مُلاّ کی حیثیت سے آئے اور مُلاّ کے مُلاّ رہے۔ ابوالفضل اور فیضی اپنی ذہانت، علم وفضل اور اعلیٰ صلاحیتوں کی بدولت ان سے آگے نکل گئے اور بادشاہ کے مقرّبِ خاص بن گئے۔ اس کتاب میں انہوں نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے بدایونی کے مفصّل بیانات کا سبب صاف ظاہر ہے۔ دوسرے مؤرّخین کو وہ مواقع میسّر نہ تھے جو بدایونی کو تھے، اِس لیے ان کی کتابوں میں اس فتنے کا ذکر اوّل تو ملتا ہی نہیں اور اگر ملتا ہے تو بالاختصار۔ ویسے یہ دعوےٰ بجائے خود محلِّ نظر ہے کہ اس دَور کی سبھی تاریخیں اکبر کے الحاد و بے دینی کے ذکر سے خالی ہیں اور بدایونی کی تاریخ منتخب التواریخ اس باب میں منفرد ہے۔ اکبر کے دربار میں ان دنوں پرتگیزی مشنری خاصا اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی یادداشتوں میں اکبر کے الحاد اور اسلام سے انحراف کا واضح الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ سب سے بڑھ کر ابوالفضل کی کتاب "آئینِ اکبری" ہے جس میں اگرچہ اس نے بادشاہ کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے، تاہم اس کے مندرجات سے صاف آشکارا ہوتا ہے کہ بدایونی نے جو کچھ لکھا وہ بے بنیاد نہیں تھا۔ چنانچہ ہم نے منتخب التواریخ کے مندرجات کی تائید میں "آئینِ اکبری" سے بھی جگہ جگہ استشہاد کیا ہے۔

بعض محقّقین نے بدایونی کی مخالفت کا جو سبب بیان کیا ہے، وہ محض ان کی ذہنی اختراع ہے۔ بدایونی محض مُلاّ نہیں تھے۔ انہیں اپنے عہد کے علوم وفنون پر عبورِ کامل حاصل تھا۔ وہ فارسی، عربی، سنسکرت اور تاریخ کے فاضل تھے۔ ان کے علم وفضل کا اندازہ ان کی تصانیف اور تراجم سے ہوتا ہے۔ جس دربار میں مسخروں اور یاوہ گوؤں کو مقامِ عزّت واکرام اور مناصبِ جلیلہ حاصل ہوں، اس میں بدایونی کے لیے اپنا مقام پیدا کرنا کیا مشکل تھا، مگر اس کے لیے ضمیر وایمان کی دولت سے محرومی شرطِ اوّل تھی۔ ابتدا میں بدایونی بہتیرے دوسرے دین فروشوں کی طرح اس راہ پر گامزن بھی ہوئے اور التفاتِ شاہی سے نوازے بھی گئے، مگر جلد ہی سنبھل گئے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ بادشاہ کی نظروں سے گر گئے۔

رہا حسد کا معاملہ، تو بدایونی نے جہاں ابوالفضل اور فیضی کے ملحدانہ شب و روز اور افکار و نظریات پر کڑی نکتہ چینی کی ہے وہاں ان کے علم و فضل کو خراجِ تحسین بھی بڑی فیاضی سے ادا کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، اسے پڑھ کر کوئی شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ حسد کی آگ میں جلنے والے شخص کے قلم سے ایسے کلمات نکل سکتے ہیں۔

درحقیقت بدایونی نے اکبر کے الحاد کے متعلق جو کچھ تحریر کیا ہے، ایک واقعہ نگار کی حیثیت سے کیا ہے اور ہمیں اسی نقطۂ نظر سے ان کے بیانات کو پرکھنا ہوگا۔ منتخب التّواریخ میں بدایونی ہمیں ایک حقیقت نگار مؤرّخ نظر آتے ہیں۔ ان کی صداقت بیانی کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ وہ خود اپنی زندگی کے ناگفتہ بہ اور تاریک پہلو بھی کسی تحفّظِ ذہنی اور تاویل و تامّل کے بغیر پیش کر دیتے ہیں۔ محمد حسین آزاد نے بھی جو بدایونی کو حاسد قرار دیتے ہیں ان کی اس صداقت شعاری کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "مُلّا صاحب نے اس تاریخ میں غیر کی یا اپنی کوئی بات نہیں چھپائی"۔ ایلیٹ نے بدایونی کی سب سے بڑی خوبی یہی بیان کی ہے کہ وہ حقیقت نگار ہیں۔ وہ لکھتا ہے: "ایسے بہت کم واقعہ نگار ہیں جو بدایونی کی طرح اپنے جذبات کا اظہار کرنا جانتے ہیں۔ خصوصاً جو شاہی کانوں کو ناگوار ہوں اور جو اپنی غلطیوں اور لغزشوں کو اس وضاحت اور بے توجّہی سے آشکارا کر دیتے ہیں"۔ جو شخص اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے غلط بیانی سے کام نہیں لیتا اس کے متعلّق یہ کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ اس نے دوسروں کے متعلّق غلط بیانی سے کام لیا ہوگا۔ بدایونی کی یہی صاف گوئی اور حق پسندی تھی جس کی بنا پر یہ کتاب ایک مدّت تک عتابِ شاہی کا ہدف بنی رہی۔

انہی وجوہ کی بنا پر ہمارے نزدیک بدایونی کی یہ کتاب عہدِ اکبری کی دینی تاریخ کا سب سے قابلِ اعتماد ماخذ اور لائقِ استشہاد دستاویز ہے۔ کتاب کے آخر میں ہم نے ان اہم شخصیات کے حالات بھی بیان کر دیئے ہیں جن کا ذکر مقالے میں ہوا ہے۔ اس

طرح سے کتاب کا یہ حصّہ بجائے خود ایک مستقل علمی و ادبی اہمیّت اپنے دامن میں رکھتا ہے۔

لاہور
۲۰ جنوری ۷۶ء

آباد شاہ پوری

صاحبِ مکتوبات

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وُہ ہند میں سرمایۂ مِلّت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

(اقبال)

حضرتِ مجدد الف ثانیؒ کا اسم گرامی احمد ہے۔ نسباً فاروقی ہیں۔ سرہند کے مقام پر ۱۴ شوال ۹۷۱ھ (۱۵۶۴ء) کو پیدا ہوئے۔ والدِ گرامی شیخ عبد الواحد کا شمار اپنے وقت کے مشائخ میں ہوتا تھا۔ سلسلۂ چشتیہ کے شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ کے خلیفہ تھے۔ شاہ کمال کیتھلی سے طریقۂ قادریہ کی اجازت بھی حاصل تھی۔ اس طرح سے آپ کی ذات میں دونوں سلسلوں کی نسبتیں جمع ہو گئی تھیں۔ شیخ نے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ سارے جہاں میں تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ سؤر، بندر اور ریچھ لوگوں کو ہلاک کر رہے ہیں، یکایک ایک نور ان کے سینے سے نکلا

جس میں سے ایک تخت نمودار ہوا، اس پر ایک بزرگ مسند آرا ہیں، ان کے سامنے تمام ظالم بے دین اور ملحد ذبح کئے جا رہے ہیں اور کوئی پکارنے والا پکار رہا ہے۔

جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا

شیخ نے شاہ کمال کیتھلی سے خواب کی تعبیر دریافت کی۔ انہوں نے فرمایا، تمہارے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا جس سے الحاد و بدعت کا قلع قمع ہوگا۔ حضرت مجدد اسی خواب کی تعبیر تھے۔

ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ چھوٹی عمر ہی میں قرآن حفظ کیا۔ پھر سیالکوٹ تشریف لے گئے جو ان دنوں مدینۃ العلم شمار ہوتا تھا اور جہاں بڑے بڑے اصحابِ فضل وکمال موجود تھے۔ منطق، فلسفہ اور کلام مولانا کمال الدین کشمیری سے پڑھا اور تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم مولانا محمد یعقوب کشمیری اور قاضی بہلول بدخشانی سے حاصل کی۔ سترہ برس کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے وطن میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ کچھ مدت کے بعد دارالحکومت اکبر آباد (آگرہ) تشریف لے گئے۔ جہاں ان دنوں تعقل پرستوں اور علمائے دین کے درمیان فکری و علمی کشمکش برپا تھی اور الحاد و رفض کا فتنہ پورے عروج پر تھا۔ ابوالفضل اور فیضی سے ملاقاتوں اور مباحثوں کا ذکر خواجہ محمد ہاشم کشمی نے زبدۃ المقامات میں کیا ہے۔ حضرتِ مجدد کی تصنیف "ردِ روافض" سے پتہ چلتا ہے کہ دوسرے امراء سے بھی ان کی صحبتیں رہیں اور ان صحبتوں میں رفض و تشیع پر معرکے برپا رہے۔ انہی بحث مباحثوں سے حضرتِ مجدد کو رسالہ "ردِ روافض" لکھنے کا خیال آیا۔

اکبر آباد سے وطن سرہند پہنچے تو سلوک و معرفت کی راہ پر گامزن ہوئے۔ چشتیہ، سہروردیہ اور قادریہ طریقے اپنے والد بزرگوار سے حاصل کئے۔ پھر نقشبندیہ سلسلے میں حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت ہوئے۔ حضرت خواجہ اپنے اس مرید کے احوالِ روحانی اور علمی صلاحیتوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ اپنے خطوط میں ان کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں۔ انہیں مستقبل کا روشن چراغ قرار دیتے ہیں، جس کے نور سے ظلمتیں کافور

ہونے والی ہیں۔

حضرت مجدّدؒ نے برِصغیر پاکستان و ہند میں دعوت و اصلاح کا جو عظیم الشّان کارنامہ انجام دیا، اس کے ایک رخ ــــ سیاسی ــــ کی مفصّل داستان آگے آتی ہے۔ اس دعوت و اصلاح کا دینی رُخ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ اس رُخ کے مفصّل بیان کے لیے بھی ایک کتاب درکار ہے، تاہم اس کے اجمالی ذکر سے حضرت مجدّد کے کارِ دعوت و اصلاح کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

فکر و اعتقاد اور عمل و کردار میں فساد اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے متعلّق عقیدے اور نقطۂ نظر کی خرابی سے پیدا ہوتا ہے۔ اعتقادی و عملی گمراہیوں کا منبع یہی ایک خرابی ہے۔ حضرت مجدّد کے دور میں مسلمانوں کی فکری و عملی زندگی میں جو گوناگوں خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، انہیں دور کرنے کے لیے انھوں نے اللہ کی ذات و صفات سے متعلق اسلامی تعلیمات کو مبرہن بیان کیا۔ توحید کی دعوت دی، شرک کی تردید کی اور مسلمان معاشرے میں جو مشرکانہ رسوم مروّج تھیں، ان سے باز رہنے کی تلقین کی۔

توحید کے متعلق ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :۔

"چاہیئے کہ پہلے باطل خداؤں کی نفی اور معبود برحق جلّ شانہ کا اثبات کریں ..... سب سے بڑھ کر عبادت کلمہ طیّبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی نفی و اثبات میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ اللہ فرماتا ہے اگر میرے سوا سات آسمان اور سات زمینیں ایک پلڑے میں اور کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو کلمے والا پلڑا بھاری رہے گا۔ کلمہ کی یہ افضلیت اس لیے ہے کہ اس کا ایک ٹکڑا ماسوائے حق یعنی ارض و سماوات، عرش و کرسی، لوح و قلم اور علم و آدم کی نفی کرتا ہے اور دوسرا ٹکڑا معبود برحق کا اثبات کرتا ہے، جو ارض و سماوات کا خالق ہے۔ ماسوا اللہ انفس و آفاق میں جو کچھ ہے، سب چون و چند کے داغ سے آلودہ ہے۔ اس لحاظ سے انفس و آفاق کے آئینوں میں جو شے بھی جلوہ گر ہے، وہ

کہیں زیادہ چون و چند سے داغدار ہوگی اور اس کی نفی لازمی ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں: اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ۔ کیا تم ان چیزوں کی عبادت کرتے ہو جنہیں تم اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو حالانکہ اللہ نے تمہیں اور تمہارے اعمال وصنائع کو پیدا کیا ہے۔

ہر وہ شے جو ہماری تراشیدہ اور بنائی ہوئی ہے، خواہ ہاتھ کی یا عقل و وہم کی، اللہ کی مخلوق ہے اور عبادت کی سزاوار نہیں۔ سزاوار عبادت وہی خدائے بیچون وبیچگوں ہے، جس کے ادراک سے ہماری عقل و وہم قاصر ہے"۔

(مکتوب ۹ دفتر دوم)

شرک کی تردید ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"کسی کو اللہ تعالیٰ کا ساجھی نہ بنایا جائے نہ ذات وصفات میں نہ عبادت میں۔ جس شخص کے اعمال ریا و سمعہ سے پاک نہیں اور جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے اجر طلب کرنے کے فتنے میں مبتلا ہے، وہ دائرۂ شرک سے باہر نہیں ہے اور نہ وہ موحد اور مخلص ہے.... کفر سے بیزار ہونا اسلام کی شرط ہے اور شرک سے پاک ہونا توحید کی علامت۔ دکھ اور بیماری کے ازالے کے لیے اصنام اور طاغوت سے استعانت، جو جاہل مسلمانوں میں رائج ہے، عین شرک اور ضلالت ہے۔ تراشیدہ و ناتراشیدہ پتھروں سے حاجت روائی کفر محض ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ ؕ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا۔ یہ لوگ اپنے معاملات کا فیصلہ کروانے کے لیے طاغوت کے پاس لے جانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ انہیں طاغوت کے انکار کا حکم دیا گیا ہے اور شیطان تو چاہتا ہے کہ انہیں

شدید ترین گمراہیوں میں گم کر دے"۔

اس کے بعد ان جاہلانہ اور مشرکانہ رسوم و شعائر کا بالتفصیل ذکر کرتے ہیں۔ جو مسلمان معاشرے میں مروّج تھے۔

توحید کے اثبات اور ردِّ شرک کے بعد سب سے زیادہ زور اتباعِ رسول پر دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل وکردار اُس زندگی کا نمونہ ہے جس پر انسان کی اخروی نجات اور ابدی فلاح کا دار و مدار ہے۔ اس نمونے کی اتباع انسان کو ہر قسم کی اعتقادی او فکری گمراہیوں اور اخلاقی و معاشرتی مفاسد اور عملی زندگی کو کج رویوں سے محفوظ رکھتی ہے ور اس سے انحراف اس کے فکر و عمل کو ہر طرح کی خرابیوں اور مفاسد کی شکارگاہ بنا دیتی ہے۔ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :

"انسان کی پیدائش کا مقصد عبادت و طاعت اور خدائے بزرگ و برتر کی طرف ہر لحے انابت ہے اور یہ بات سیّد الاوّلین والآخرین صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سنّت کے اتّباع سے پیدا ہو سکتی ہے۔ ظاہری و باطنی کامل اتّباع سے"۔

عجمی تصوّف نے ویدانتی یوگ کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے دیندار طبقے میں جو راہ پا لی تھی اس کی اوّلین زد اتباعِ رسولؐ پر پڑ رہی تھی۔ صوفیاء نے ریاضت، مجاہدوں اور اذکار و اعمال کے ایسے طریقے رائج کر دیئے تھے، جن کا رسولِ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی میں نام و نشان تک نہیں ملتا۔ حضرتِ مجدّدؒ ان اعمال و اشغال کو بے ثمر بلکہ موجبِ وبال گردانتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اتباع کی تلقین کرتے ہیں۔

"قیامت کے روز صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اتّباع ہی کام آئے گی صوفیاء کے حال، وجد، علوم، معارف، رموز و اشارات اگر اس اتباع کے مطابق ہوں تو بہت خوب ہیں۔ ورنہ دین میں خسران اور اللہ تعالیٰ کے عتاب کا موجب

ہیں۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی کو کسی نے خواب میں دیکھا۔ ان کا حال پوچھا۔ فرمایا: سارے رموز و اشارات رائیگاں گئے، سارے علوم و معارف ہیچ ثابت ہوئے۔ کام آئیں تو صرف وہ چند رکعتیں جو پچھلی راتوں کو پڑھا کرتا تھا۔" لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین کی اتباع کو ضروری سمجھو، کیونکہ اس اتباع میں سراسر برکت ہے اور شریعتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سے قولاً اور اعتقاداً مکمل احتراز کرو، کیونکہ یہ مخالفت سراسر نحوست اور تباہی کا موجب ہے۔"

(مکتوب ۱۰۵ دفتر اول)

اتباعِ سنّت کی دعوت کے ساتھ ساتھ بدعت سے اجتناب پر بھی بہت زور دیتے تھے۔ علماء نے بدعتِ حسنہ کے نام پر طرح طرح کی بدعات کے دروازے دین میں کھول دیئے تھے۔ حضرت مجدد کا ارشاد تھا کہ بدعت ہر حال میں بدعت ہے اور اس میں کوئی حسن و خوبی نہیں ہے۔ اس سے اجتناب و احتراز سنّتِ رسول کے اتباع کا اوّلین تقاضا ہے۔ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"علماء کا قول ہے کہ بدعت دو طرح کی ہوتی ہے۔ اوّل بدعتِ حسنہ۔ دوم بدعتِ سیّئہ۔ بدعتِ حسنہ وہ عمل ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے کے بعد وجود میں آیا، لیکن رافعِ سنّت نہیں ہے اور بدعتِ سیّئہ وہ ہے جو رافعِ سنّت ہو یعنی جس سے سنت مٹے۔ لیکن فقیر کے نزدیک ان دونوں میں کوئی خوبی اور روشنی نہیں ہے۔ ہر قسم کی بدعت ظلمت اور کدورت ہی اپنے دامن میں رکھتی ہے۔ اگر کسی شخص کو ضعفِ بصارت کی بنا پر بدعت میں کوئی حُسن و خوبی نظر آتی ہے تو کل قیامت کے دن جب اس کی نگاہ تیز ہوگی، اسے پتہ چل جائے گا کہ بدعت کا ثمرہ ندامت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مَنْ اَحْدَثَ فِی اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ۔ جس

کسی نے ہمارے دین میں کوئی ایسی بات ایجاد کی جو اس میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے لہٰذا ایک رد کردہ چیز حسن و خوبی کی حامل کیونکر ہو سکتی ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ ارشاد بھی ہے۔ فَاِنَّ خَیْرَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰہِ وَخَیْرَ الْھَدیٰ ھَدیُ مُحَمَّدٍ وَشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُھَا بِدْعَۃٌ وَکُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ وَکُلُّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ۔ بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے اور بہترین ہدایت محمد صلّی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے۔ بد ترین چیز بدعات ہیں ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ کی نذر ہونے والی ہے"۔

(مکتوب ۱۸۶ دفتر اوّل)

جاہلانہ تصوف نے شریعت اور طریقت کے درمیان تفریق پیدا کر دی تھی۔ سلوک و طریقت کے راہرو کے لیے شریعت کی پیروی ضروری نہیں تھی بلکہ جو شخص شریعت سے جتنا آزاد ہوتا تھا اتنا ہی بڑا سالک اور پیرِ طریقت سمجھا جاتا تھا۔ حضرتِ مجدد نے اس پر کڑی تنقید کی۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"مرشد یا پیرِ طریقت وہ ہے جو مرید کو انابت الی اللہ کی ترغیب دے اور اس تک پہنچنے کا راستہ دکھائے۔ شریعت کا مقصود یہ ہے کہ نفسِ اَمّارہ کی خواہشات مغلوب ہو جائیں۔ لہٰذا جو شخص اپنے نفس کو مغلوب کرنے کا خواہاں ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ شریعت کی پابندی کرے۔ جو شخص جس قدر اتباعِ شریعت کی پابندی کرے گا اسی قدر خواہشاتِ نفس سے دُور ہوتا جائے گا۔ کیونکہ نفس پر اتباعِ شریعت سے بڑھ کر گراں کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جو ریاضتیں اور مجاہدے اتباعِ شریعت کے مطابق نہیں ہیں وہ نہ قابلِ اعتبار ہیں نہ مفید"۔

ایک اور مکتوب میں ولایت کی علامت اتباعِ شریعت قرار دیتے ہیں:

"وہ علامت جس سے یہ امتیاز ہو سکتا ہے کہ کون سچا (ولی) ہے اور کون جھوٹا، یہ ہے کہ جو شخص شریعت کا پابند ہے، جس کی مجلس میں انسان کا دل

اللہ تعالیٰ کی طرف راغب و متوجّہ ہو اور ماسوا کی طرف سے سرد ہو جائے، وہ سچا ہے اور اختلافِ مدارج کے ساتھ اولیاء میں شامل ہے، لیکن جن لوگوں کے اعمال اس گروہ سے مطابقت نہیں رکھتے وہ محرومِ مطلق ہیں۔"

(مکتوب ۹۲ دفتر دوم)

حضرتِ مجدد ظاہرِ شریعت کی مخالف باتوں کو کفرِ طریقت قرار دیتے ہیں :-

"مشائخ قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم میں سے جس بزرگ نے شطحیات زبان سے نکالی ہیں اور ظاہرِ شریعت کی مخالف باتیں کہی ہیں، وہ سب کفرِ طریقت کے مقام میں ہوئی ہیں، جو مستی و بے تمیزی کا مقام ہے۔ جو بزرگ اسلام کی دولتِ حقیقت سے مشرف ہوئے ہیں وہ اس قسم کی باتوں سے پاک اور بری ہیں۔ وہ ظاہر و باطن میں انبیاء کے پیروکار اور متبع ہیں۔"

(مکتوب ۹۵ دفتر دوم)

بعض صوفیاء نے سماع و مزامیر، وجد و حال اور رقص کو جزوِ عبادت بنالیا تھا۔ حضرتِ مجدد نے اسے صوفیانِ خام کا عمل قرار دیا اور لکھا کہ شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ فرماتے ہیں :

"غنا کی حرمت میں آیات و حدیث اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا شمار کرنے سے انسان معذور ہے۔ کسی زمانے اور کسی دور میں کسی ایک فقیہ نے بھی سرود کے مباح ہونے کا فتوٰی نہیں دیا اور نہ رقص اور پاکوبی کو جائز قرار دیا ہے۔ آج کے صوفیانِ خام نے سرود و رقص کو دین و طاعت اور عبادت بنالیا ہے۔

اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَھُمْ لَھْوًا وَّلَعِبًا

(یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دین کو لہو و لعب بنا لیا ہے")

(مکتوب ۲۶۶ دفتر اول)

حضرت مجددؒ نے جاہلانہ تصوّف اور اس کے شعائر ہی پر تنقید نہیں کی، تصوّف کے فلسفہ وحدت الوجود کو بھی نکتہ چینی کا ہدف بنایا اور اس کے بجائے وحدت الشہود پر زور دیا وحدت الوجود کا فلسفہ جیسا کہ ہم "شخصیات" کے ضمن میں آگے چل کر بوضاحت بیان کریں گے. ابن عربی نے رائج کیا۔ اس فلسفے کے پیچھے جو فکر کارفرما ہے اس کی نہ قرآن و حدیث سے تائید ہوتی ہے۔ نہ صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین کی زندگی اور فکر و عمل سے۔

اس فلسفے نے طبقۂ صوفیاء کی فکری و اعتقادی گمراہیوں میں مزید اضافہ کیا اور عملی طور پر انہیں ناکارہ کر کے رکھ دیا، چونکہ اس زمانے میں صوفیاء کا عوام پر گہرا اثر تھا اور بیعت اور حلقہ بگوشی کا رواج عام تھا اس لیے عوام کا فکر و ذہن اور عمل و کردار بھی بری طرح متاثر ہو رہا تھا. جب خالق و مخلوق ذات و صفات کے اعتبار سے ایک ہوں اور مخلوق خالق کا ظل ہو تو حق و باطل، بدی اور نیکی، معروف اور منکر کے درمیان تمیز کوئی معنی نہیں رکھتی۔ پھر انسان سے جو کچھ بھی صادر ہو حق اور روا ہے اُسے خوشدلی سے گوارا کرنا چاہیئے۔ اس فلسفے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ صوفیاء اور عوام کے اندر منکرات اور باطل نظریات سے مصالحت اور مداہنت کا جذبہ پیدا ہو گیا اور ان کے خلاف قوتِ مزاحمت ختم ہو کر رہ گئی۔ حضرت مجددؒ نے ابتدا ہی میں صوفیاء اور ان کے ذریعے عام دیندار مسلمانوں میں پھیلے ہوئے اس مرض کو بھانپ لیا، چنانچہ انہوں نے وحدت الوجود کے نظریہ پر بھرپور تنقید کی اور عبد اور معبود اور مخلوق اور خالق کے فرق کو دوٹوک الفاظ میں واضح کیا۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"انسان کی پیدائش کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی عبدیت کے وظائف ادا کرے...... ولایت کے مدارج میں مقام عبدیت سے بالاتر کوئی مقام نہیں۔ اس مقام میں بندہ اپنے مولا کے ساتھ (بجز بندگی کے) اپنی کوئی نسبت نہیں پاتا...... خلیّت کا تعلق بھی ان مناسبتوں سے ہے اور وہ اس نسبت سے پاک اور منزہ ہے۔ ہم حق تعالیٰ کو خالق اور اپنے آپ کو مخلوق جانتے ہیں۔

اس سے زیادہ کچھ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتے"۔

(مکتوب ۳۰ دفتر اوّل)

اسی مکتوب میں آگے چل کر وحدت الفعل (یعنی یہ تصوّر کہ دنیا میں کسی بھی شخص سے جو فعل بھی سرزد ہوتا ہے اُس کا فاعل وہ شخص نہیں بلکہ حق تعالیٰ ہے) پر تنقید کرنے، اُسے خلاف شریعت اور از قسمِ سُکریات قرار دینے کے بعد لکھتے ہیں:

"اسی نوعیت کا کلام وہ ہے جو بعض صوفیائے نے وحدت الوجود کے سلسلے میں کہا ہے۔ وہ بھی سُکرِ وقت اور غلبۂ حال پر مبنی ہے۔ علومِ لدُنّی کی صحت کا نشان یہ ہے کہ وہ علومِ شریعت کے عین مطابق ہوں۔ اگر بال بھر بھی متجاوز ہوں گے تو انہیں سُکر قرار دیا جائے گا۔ حق وہی ہے جو علمائے اہلِ سنّت سے ثابت ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ زندقہ والحاد ہے یا سُکرِ وقت اور غلبۂ احوال۔ اور علومِ شریعت سے مطابقت مقامِ عبدیّت ہی میں میسّر آ سکتی ہے۔"

(ایضاً)

وحدت الوجود کے ماننے والوں میں بڑے بڑے مشائخ اور بزرگ نظر آتے ہیں ان سے بعض ایسے کلمات اور اقوال منسوب کئے جاتے ہیں جن کو اگر ان کے ظاہری معنوں پر محمول کیا جائے تو ان بزرگوں کا ایمان و اسلام تک مشتبہ قرار پاتا ہے۔ اس لیے علماء کا ایک گروہ ان کلمات و اقوال کو عالمِ سُکر کے شطحیات گردانتا ہے اور ان کی قابلِ قبول تاویل کرتا ہے۔ حضرتِ مجدّدؒ اسی گروہ کے آدمی ہیں۔ وہ ابنِ عربی کے نظریۂ وحدت الوجود کی تاویل کرتے ہیں اور اسے محض "علم الیقین" کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ ان کی رائے میں تصوّف و طریقت کے مراحل میں ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے کہ سالک کی نظر سے ماسوائے حق ہر شے مخفی ہو جاتی ہے اور غلبۂ حال میں اس کی زبان پر انا الحق اور سبحان ما اعظم شانی کے الفاظ جاری ہو جاتے ہیں۔ حضرتِ مجدّدؒ ان الفاظ کی بھی تاویل کرتے ہیں، تاہم کہتے ہیں

کہ یہ لوگ علم الیقین ہی کو کمال آخری سمجھتے ہیں اور اسی مرحلے میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں، حالانکہ یہ مرحلہ محض ایک تمثیلی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ مثال بھی دیتے ہیں:

"مثلاً کسی شخص نے مقامِ بادشاہت کے ساتھ گہری نسبت کی بنا پر خواب میں دیکھا کہ وہ بادشاہ بن گیا ہے اور بادشاہت کے تمام لوازمات اسے میسر آگئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ فی الواقع بادشاہ نہیں بنا بلکہ محض ایک تمثیلی صورت اس کے سامنے آئی ہے۔ حقیقی بادشاہت کا اس تمثیلی صورت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

(مکتوب ۴۳ دفتر اول)

حضرت مجددؒ نے وحدت الوجود کے بجائے وحدت الشہود کے نظریہ کو پُرزور استدلال کے ساتھ پیش کیا۔ وہ ان دونوں نظریات کا فرق واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مثلاً ایک شخص کو آفتاب کا یقینی علم حاصل ہو جاتا ہے۔ اس علم الیقین کے لیے لازمی نہیں ہے کہ اس وقت ستاروں کے وجود کو معدوم سمجھے۔ جس وقت وہ آفتاب کو دیکھے گا ستارے نظر نہ آئیں گے۔ آفتاب کے سوا اسے کچھ دکھائی نہیں دے گا، تاہم وہ ستاروں کو معدوم نہ سمجھے گا۔ یہ بات اس کے علم میں ہوگی کہ ستارے موجود ہیں۔ البتہ سورج کی روشنی میں مغلوب ہونے کی وجہ سے (نگاہوں سے) اوجھل ہیں۔ جو لوگ اس وقت ستاروں کے وجود کا انکار کرتے ہیں یہ شخص خوب جانتا ہے کہ ان کی معرفت درست نہیں ہے لہٰذا وحدت الوجود (کا نظریہ) جو ماسوائے ذاتِ حق ہر شے کی نفی پر مبنی ہے، عقل و شریعت دونوں کے خلاف ہے۔ اس کے برعکس وحدت الشہود (یعنی سالک کو ایک کے سوا اور کچھ مشہود نہ ہونا) شریعت کے خلاف نہیں ہے۔ مثلاً آفتاب کی

روشنی میں ستاروں کے وجود کی نفی کرنا اور ان کو معدوم سمجھنا خلافِ حقیقت ہے لیکن اس وقت ستاروں کو نہ دیکھنا خلافِ حقیقت نہیں ہے، بلکہ اس کا سبب آفتاب کی روشنی کا غلبہ اور دیکھنے والے کی کمزوری ہے۔ اگر دیکھنے والے کی آنکھ اسی آفتاب کی روشنی سے منوّر اور قوی ہو جائے تو ستارے بھی واضح طور پر دیکھ سکے گا اور یہ نظارہ حق الیقین کے درجے میں ہو گا"۔

اس طرح وحدت الشہود کے ذریعے حضرت مجددؒ نے عبد اور معبود کے درمیان ایک خطِ واضح کھینچ دیا۔ عبد ہر حالت میں عبد ہے اور عبدیّت کے وظائف و فرائض اور شریعت کی اطاعت و پیروی سے کسی حال میں بھی مستثنیٰ نہیں اور نہ وہ حق و باطل اور معروف و منکر کے سلسلے میں بندگی کی ذمّہ داریوں اور ان کے نتائج و عواقب سے اپنا دامن بچا سکتا ہے۔

حضرتِ مجددؒ ورع و تقویٰ اور علم و عمل کا پیکر تھے۔ ہمیشہ عزیمت کی راہ اختیار کی۔ ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ کو ۶۲ سال کی عمر میں انتقال کیا اور سرہند میں مدفون ہوئے۔

حضرت مجددؒ کا سیاسی کارنامہ

حضرت مجدد الف ثانی رح کو اسلامی ہند کی تاریخ میں جو مقام بلند و عظیم حاصل ہے اُسے کوئی مؤرّخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ شیخ مجدد رح اس دور میں پیدا ہوئے جب اسلامی ہند تعقل پرستی، تشیّع، علمائے سُو اور جاہلانہ تصوّف کا شکار ہو رہا تھا۔ عام حالات میں ملّتِ اسلامیۂ ہند کے لیے یہ فتنے شاید زیادہ خطرناک نہ ہوتے لیکن ایک طرف علمائے بدعت و سُو اور جاہل صوفیوں نے عام مسلمانوں کو اوہام و خرافات کا صیدِ زبوں بنا کر کتاب و سنّت کی روشن و مصفّٰی تعلیمات کے ساتھ ان کا تعلق منقطع اور اسلام کے لیے ان کی قوّتِ مزاحمت کمزور کر دی تھی، دوسری جانب ان کی کوتاہ بینی، فروعات پر معرکہ آرائیوں، پستیٔ کردار اور عزت وجاہ کی حرص نے اقتدار کو اسلام سے عناد اور بغض و بغاوت کی راہ پر ڈال دیا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ دربارِ شاہی میں ایرانی اُمراء و علماء کا اثر و رسوخ اور برسرِ اقتدار خاندان، بالخصوص بادشاہ کی ہندو بیویوں کے اثرات کوڑھ پر کھاج کا کام دے رہے تھے۔ ملّت کی دینی و فکری بنیادیں ڈھے رہی تھیں، اسلامی شعائر مٹ رہے تھے اور غیر اسلامی اور ہندوانہ مراسم

رواج پا رہے تھے۔ اکبر نے پہلے اجتہاد کا منصب سنبھالا اور پھر خود ایک دین کی بنیاد رکھ دی جس کا مقصدِ وحید اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی انفرادیت ختم کرکے اس دین کی اساس پر مخلوط اور وطنی قومیت وجود میں لانا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ ان سارے فتنوں سے نبرد آزما ہوئے اور بالآخر اسلامی ہند کی تاریخ کا رخ موڑ دینے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ انہی کی سعی و جہد کا ثمرہ تھا کہ دینِ الٰہی اکبر کی موت کے بعد نہ پنپ سکا۔ عہدِ جہانگیر سے رُخِ حالات بدلنا شروع ہوا، شاہجہان کے زمانے میں ایک بالکل مختلف فضا پیدا ہو گئی اور عہدِ عالمگیر میں تو گویا اسلامی ہند کے زمین و آسمان ہی بدل گئے۔ اگر حضرت مجدد الف ثانیؒ میدان میں نہ آتے تو شاید آج برصغیر کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔

حضرت مجددؒ کے اس کارنامے کی اہمیت کا پورا پورا اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ مجمل داستان قدرے مفصل بیان کی جائے۔

خوش عقیدہ بادشاہ

اکبر تیرہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اللہ نے اسے ذہانت و فطانت سے نوازا تھا، مگر تیرہ برس کے اس عرصے میں ہمایوں یا تو جلاوطنی اور سرگردانی کے مصائب جھیلتا رہا تھا یا سلطنتِ گم گشتہ واپس لینے کی تدبیروں اور سعی و جہد میں مصروف، اس لیے اکبر کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دینے کا موقع ہی نہ ملا۔ اس کی ناگہانی موت نے ایک کم سن، ناپختہ دماغ، مگر ذہین لڑکے کے فرق پر اسلامی ہند کا تاج رکھ دیا۔ کم سن بادشاہ ابتدائی سالوں میں پُرجوش مذہبی آدمی تھا۔ وہ ہمیں اہل اللہ اور صالحین کی مجلس میں حاضری دیتے، علماء و مشائخ کی صحبت میں شریک ہوتے اور ان کی جوتیاں سیدھی کرتے نظر آتا ہے۔ ہم اسے احکامِ شرعی کے اجراء و نفاذ کا اہتمام اور مفتیوں اور قاضیوں کا تقرر کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ سفر ہو یا حضر نماز باجماعت ترک نہیں ہوتی۔ اکثر راتیں بھی عبادت اور وظائف

اوراد میں گزرتی ہیں درباریوں کو ہر دربار نماز کی تلقین کرتا ہے۔ اپنے احکامِ خاص سے مسجدیں تعمیر کرواتا ہے، حج اور جہاد کا اہتمام کرتا ہے۔ خواجۂ اجمیری کے مزار پر ہر سال سات کوس سے پیدل چل کر حاضری دیتا ہے اور منتیں مانتا اور مرادیں مانگتا ہے۔ جہانگیر کے تولّد سے پہلے اس کی والدہ کو حصولِ برکت کے لیے شیخ سلیم چشتی رح کے حجرے میں بھیج دیتا ہے اور نومولود کا نام شیخ کے نام پر سلیم رکھتا ہے۔ شہزادہ دانیال اجمیر کے ایک مجاور کے گھر میں پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے مذہب کے ساتھ اس کا یہ تعلق اور علماء و مشائخ کا یہ اجلال و احترام شعوری نہیں جذباتی اور خوش اعتقادی پر مبنی تھا، جو اسے عام سادہ، دیندار اور خوش عقیدہ ترکوں کی طرح باپ دادا سے میراث میں ملا تھا۔ جذبات کسی وقت بھی سرد ہو سکتے ہیں یا اپنا مرکزِ عقیدت بدل سکتے ہیں اور خوش عقیدگی ذہن و شعور کی گہرائیوں سے اٹھنے والی کسی بھی غلط یا صحیح فکری لہر یا خارجی عوامل کے ہاتھوں دم توڑ سکتی ہے۔ خصوصاً جب جذباتیت اور خوش اعتقادی نہ صرف ٹھوس بنیادوں سے محروم ہو بلکہ علم و شعور کی ابتدائی اساس سے بھی تہی دامن ہو اور آدمی کو زرخیز اور شوقِ تجسّس سے مالا مال ذہن ودیعت ہوا ہو، چنانچہ یہی حشر اکبر کی جذباتی مذہبیت اور خوش اعتقادی کا ہوا۔

علمائے سُو کا کردار

فتح پور سیکری میں قلعہ اور شاہی محلات تعمیر ہوئے، تو شیخ سلیم چشتی رح کی نئی خانقاہ کے ساتھ ایک عبادت خانہ بھی تعمیر کیا گیا، جہاں ہر جمعہ کی نماز کے بعد اکبر اپنی جذباتی مذہبیت، خوش اعتقادی اور ذہنی تجسّس کی تسکین کے لیے ایک دربارِ خاص منعقد کرتا، جس میں مشائخ، علماء، فضلا اور مقرّبینِ خاص شریک ہوتے۔ یہ ذوق و شوق بعد ازاں اتنا بڑھا کہ جمعہ کی پوری رات اس محفل میں گزر جاتی۔ بد قسمتی سے یہی محفلیں اور صحبتیں بادشاہ کو اسلام سے برگشتہ اور متنفر کرنے کا موجب ہو گئیں۔ بادشاہ اپنے عہد کے

علماء کو غزالی و رازی سے بھی بڑھ کر خیال کرتا تھا، چنانچہ اسی حسنِ ظن کے تحت وہ ان کے علم سے استفادہ کرنا چاہتا تھا۔ ادھر ان کا حال یہ تھا کہ ہر شخص حُبِ عزّ و جاہ کے نشے میں سرشار تھا۔ ان کی یہی حرص و ہوس انہیں ان مجلسوں میں کھینچ لائی تھی، چنانچہ پہلے ان کے درمیان بادشاہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے نشست گاہوں پر رقیبانہ کشمکش چھڑی، پھر بادشاہ پر اپنے علم و تفقہ کا سکہ جمانے اور ایک دوسرے کو گرانے کی جدّ و جہد شروع ہوئی۔ اختلافات کو ہوا ہی نہیں دی گئی، پیدا کئے گئے اور فقہی و علمی موشگافیوں سے حریف کو چت کیا جانے لگا[1]۔ پھر ایک قدم آگے بڑھ کر ایک دوسرے کے علم کی تضحیک اور افکار و عقائد کی نفی و تردید ہونے لگی۔ اب یہ عالم تھا کہ "یکے فعل را حرام می گفت و دیگرے بحیلہ حلال می ساخت" (ایک عالم ایک ہی فعل کو حرام کہتا تھا اور دوسرا کسی حیلے سے اسے حلال قرار دیتا تھا) اور آخرکار بدایونی ہی کی زبان میں یہ کشمکش اور ــــــ "اختلاف بجائے رسید کہ تکفیر و تضلیل ہم وگر می نمودند"۔ یعنی ان اختلافات کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک دوسرے کو کافر اور گمراہ گردانا جانے لگا۔

اب یہ علمی مجالس نہیں تھیں، جدلی اکھاڑے تھے جن میں دینِ متین کے یہ ستون تیغ

---

[1] ان محفلوں میں ۔علم و فضل کے کیسے مظاہرے اور حریف کو شکست دینے کے لیے کیا کچھ نکتہ سنجیاں اور لطیفے ہوا کرتے تھے، ان کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ حاجی ابراہیم سرہندی اس ضمن میں ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ اپنی علمی عظمت کا سکہ بٹھانے اور بادشاہ کو متاثر کرنے کے لیے وہ گوناگوں مغالطے پیدا کرتا تھا۔ جب تاشکندی نے اپنی تفسیر بارگاہِ شاہی میں پیش کی تو حاجی نے مرزا مفلس سے پوچھا کہ "موسیٰ" کونسا صیغہ ہے اور کس مادہ سے مشتق ہے۔ مرزا کا شمار علومِ عقلیہ کے افاضل میں ہوتا تھا لیکن جانے کیوں وہ لاجواب سے ہو گئے۔ بس پھر کیا تھا حاجی کے علمی تفوق کی دھوم مچ گئی۔ کچھ لوگوں نے قاضی زادہ لشکر سے جو متھرا کا قاضی تھا، کہا کہ تم بحث مباحثہ میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟ اس نے بے ساختہ جواب دیا۔ اگر حاجی ابراہیم مجھ سے "علیتیٰ" کا صیغہ پوچھ بیٹھے، تو میں کیا جواب دوں گا۔

زبان سونت کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے تھے اور وہ شور و شغب اور ہنگامہ مچتا تھا کہ الامان والحفیظ۔ (رگِ گردنِ علمائے زماں بر آمدہ آوازہائے بلند و دمدمہ بسیار ظاہر شد) اپنے وقت کے ان غزالیوں اور رازیوں کی ان حرکتوں کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے تھا وہی ہوا۔ یعنی بادشاہ کو ناگوار گزریں (بر خاطرِ اشرف گراں آمد) اور نہ صرف ان کا وقار اس کی نظر سے گر گیا، بلکہ وہ علمائے سلف کے کردار کو بھی انہی کے کردار پر قیاس کر کے ان کی عظمت و فضیلت کا بھی منکر ہو گیا (رکاکتہائے ایشاں را دیدہ قیاس بر شاهد کردہ سلف را نیز منکر شدند) اور ان کی اس بے وقری سے دین کے وقار پر بھی ضربِ کاری لگی، مگر علماء پھر بھی نہ سنبھلے اور ان کی مذبوحی حرکات جاری رہیں، حتیٰ کہ بادشاہ اسلام ہی کی طرف سے شک میں پڑ گیا۔ در شک انداختہ حیرت در حیرت افزود مقصد را از میان رفت۔[2]

---

[2] بے علم اور خوش عقیدہ اکبر کے دربار میں کس قسم کے علماء جمع ہو گئے تھے اور ان علمی مجالس و مذاکرات میں اسلام کی نمائندگی فرما رہے تھے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان میں ایک حضرت مخدوم الملک ملا عبد اللہ سلطان پوری تھے، جنہوں نے محض فریضۂ حج کی ادائیگی سے بچنے کے لیے، حج کے اسقاط کا فتویٰ دے دیا تھا۔ استدلال یہ تھا کہ حج کے لیے خشکی کا راستہ قزلباشوں کی ترکتازیوں سے پُرخطر ہے اور سمندر کے راستے فرنگیوں سے پروانۂ راہداری لینے کی ذلت گوارا کرنی پڑتی ہے۔ اس پر حضرت عیسیٰ اور بی بی مریم کی تصویریں چھپاں ہوتی ہیں اور یہ بت پرستی کے مترادف ہے۔ بنابریں حج کے دونوں راستے مسدود ہو گئے ہیں۔ عمر بھر کبھی زکوٰۃ نہ دی۔ اس فریضے سے بچنے کے لیے یہ حیلہ اختیار کر رکھا تھا کہ سال ختم ہونے پر آتا، تو اپنی تمام دولت بیوی کے نام ہبہ کر دیتے اور وہ ایک سال پورا ہونے سے پہلے ان کے نام بخش دیتی۔ اس طرح پورا سال گزرتا تھا نہ زکواۃ دینا پڑتی۔ موت کے بعد شاہی حکم سے ان کے گھر کی تلاشی لی گئی تو صندوقوں ہی میں نہیں خاندانی قبروں میں بھی سونے اور چاندی کی اینٹیں مدفون نکلیں۔

دوسرے صاحب صدر الصدور ملا عبد النبی تھے۔ حضرت شاہ عبد القدوس گنگوہی کے پوتے۔ اکبر نے انہی کی جوتیاں سیدھی کی تھیں۔ ان کی علمیت کا بڑا شہرہ تھا۔ محدث حافظ اور امام کہلاتے تھے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

اسلام سے برگشتگی

طرہ یہ کہ ان علمی مجالس میں دوسرے مذاہب کے علما اور فضلا بھی شریک ہوتے تھے ۔ وہ اپنے مذاہب کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے اسلام پر زبانِ طعن دراز کرتے اور اپنے مذاہب کی خوبیاں بیان کرتے تھے ۔ بادشاہ ابتدا میں ان کے کردار اور طرزِ استدلال سے متاثر ہوا ہوگا ، جو دین کے ستونوں کے کردار سے بالکل مختلف تھا ، لیکن اس کا لگاؤ جس قدر اسلام سے

حاشیہ از صفحہ گذشتہ :-

مگر عالم یہ تھا کہ الحزم سوء ظن کی حدیث جب بھی سناتے الحزم کو الخرم یعنی "ح" کے بجائے "خ" اور "ز" کے بجائے "ر" پڑھا کرتے تھے اور مدتوں اس غلطی کا احساس نہ ہوا ۔ سارے ہندوستان کے ائمہ اور خطیبوں وغیرہ کی جاگیروں کا اختیار انہیں ملا ہوا تھا ۔ بدایونی کے الفاظ میں حال یہ تھا کہ —
سائر وکلائے شیخ و فراشاں و دربانان و سائیساں و حلال خوراں نیز رشوت ہائے کلی دادے دگیم ازاں ورطہ بردے"۔ یعنی لوگ شیخ کے وکیلوں ، فراشوں ، دربانوں ، سائیسوں حتیٰ کہ حلال خوروں تک کو رشوتیں دے کر اس گرداب سے اپنا کمبل چھڑاتے تھے ، جو رشوتیں نہ دے سکتے انہیں دربان ڈنڈے مار مار کر بھگا دیتے ۔ ان کے آستانے پر حاجت مندوں کا اتنا ہجوم ہوتا تھا اور انہیں اتنی دیر تک دھکے کھانے پڑتے تھے کہ کتنے ہی بدقسمت اس ہجوم میں گرمی کی تاب نہ لاکر جاں بحق ہو گئے ۔

ایک اور صاحب قاضی خان بدخشانی تھے جنہوں نے بادشاہ کو سجدہ کرنے کے جواز میں فتویٰ دیا تھا ۔ ایک اور صاحب ملا عالم کابلی تھے ۔ انہیں عمر بھر افسوس رہا کہ یہ فتویٰ انہیں کیوں نہ سوجھا اور حریف علم و تفقہ میں ان سے کیوں بازی لے گیا ۔ ایک اور شیخ امان پانی پتی کے بھتیجے ملا ابوسعید تھے جنہوں نے داڑھی منڈوانے کی "حدیث" بارگاہِ شاہی میں پیش کی تھی ۔ انہی کے خلیفہ شیخ تاج الدین ابن ذکریا اجودھنی تھے ، صوفیا کے حلقے میں تاج العارفین کہلاتے تھے اور شیخ ابن عربی ثانی سمجھے جاتے یہ حضرت شرعی پابندیوں کے قائل نہ تھے ۔ انھوں نے اسلام کے ساتھ ہندو مذہب کا جوڑ اور قرآن اور پرانوں میں باہمی مطابقت ثابت کی تھی ۔ ؏

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

گھٹتا گیا، ان مذاہب کے اصول اور مراسم اس کے دل میں گھر کرتے گئے۔ انہی میں سے ایک شیعہ عالم ملا محمد یزدی تھے جنہوں نے اکبر کو خلفائے ثلاثہ رضؓ، صحابۂ کرام رضؓ، تابعین، تبع تابعین اور سلف صالحین سے برگشتہ کیا۔ بقول بدایونی:

"ملا محمد یزدی نیز برآں صورت کہ گذشتہ بالا رفتہ طعنِ صریح و ناسزائے تبیح بر خلفائے ثلاثہ گفتہ و تکفیر و تفسیق عامہ صحابۂ کبار و تابعین و تبع تابعین و سلف و خلف صالحین از متقدمین و متاخرین رضی اللہ عنہم گروہ اہل سنت و جماعت را محقر و مہان در نظر نمود گرفت و غیر از مذاہب شیعہ ہمہ را ضال و مضل گردانید۔"

ملا محمد یزدی کی اس تبلیغ پر بادشاہ نے اسلام کی تاریخ پڑھوانی شروع کی۔ اور اس زمانے کے اختلافات دیکھ کر صحابہؓ پر سے بھی اعتقاد اٹھ گیا۔ پھر یہ خیال پیدا ہوگیا کہ دین کی بنیاد صحابہؓ کی بیان کردہ روایات کی بنا پر نہیں عقل پر رکھی جانی چاہیئے۔ بدایونی کہتے ہیں۔

"چوں تاریخ خوانده می شد، روز بروز اعتقاد از اصحاب فاسد شدن گرفت و گام فراخ تر نہادند و نماز و روزه و جمیع سنوات را تقلیدیات نام نہادند یعنی غیر معقول و مدارِ دین بر عقل گذاشتند نہ بر نقل۔"

اس "تاریخ خوانی" کے دوران میں اکبر جن تأثرات کا اظہار کرتا، اس کا ذکر بدایونی اس طرح کرتے ہیں ـــــ "و آنچہ در حق صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم در وقتِ خواندنِ سیر مذکور می ساختند۔ خصوصاً در خلافت خلفائے ثلاثہ و قضیۂ فدک و جنگ صفین و غیر آں کہ گوش از استماع آں کر باد خود بزبان نتواں آورد۔ کتب سیر کی خواندگی کے دوران میں بادشاہ کی زبان سے صحابہؓ کی شان میں جو الفاظ نکلتے تھے، خصوصاً خلفائے ثلاثہ، فدک، جنگِ صفین وغیرہ کے ذکر کے وقت جو کچھ کہا جاتا تھا، کان اگر ان کے سننے سے بہرے ہو جاتے تو بہتر تھا اپنی زبان سے میں انہیں ادا بھی نہیں کر سکتا۔

ایک اور بزرگ شیخ یعقوب کشمیری اور ان کے ہم نواؤں نے بھی بادشاہ کو گمراہ کرنے

میں کچھ کم حصّہ نہ لیا۔ شیخ یعقوب بہت سی کتابوں کے مصنّف تھے اور اپنے عہد کے مقتدا اور پیشوا گردانے جاتے تھے۔ انہوں نے قاضی ہمدانی کی تمہیدات سے بعض باتیں اخذ کر کے یہ فلسفہ گھڑا کہ خیر و شر خدا کی جانب سے ہیں، اس لیے اصلاً دونوں ایک ہیں اور ان میں کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے۔ استدلال یہ تھا کہ محمّد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے اسم "الہادی" کا مظہر ہیں اور ابلیس دوسرے اسم المضلّ کا مظہر ہے اور اس دنیا کا یہ سارا جلوہ انہی دو اسماء کا جلوہ ہے اور خدا کے یہ دونوں مظہر اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔

مزید براں ہندو اور یونانی خرافات کے امتزاج سے وجود پانے والا تصوّف تھا اور صوفیا کے شطحیات۔ مزعومات اور پریشان خیالیاں تھیں، جن سے اکبر کی آوارہ خیالی اور آزادروی کو اور تقویت پہنچی[۱]۔ ادھر آتش پرست علماء اور عیسائی پادری تھے، جو اس کی پریشان فکری میں اضافہ کر رہے تھے[۲]۔ رہی سہی کسر شیخ مبارک اور ان کے آزاد خیال اور

---

[۱] بدیوانی لکھتے ہیں کہ تاج العارفین شیخ تاج الدین گمراہ صوفیوں کے خطرناک نظریہ وحدت الوجود اور فصوص الحکم کے دوسرے مسائل مثلاً "ترجیح رجا بر خوف"۔ "ایمان فرعون" وغیرہ بادشاہ کے ذہن نشین کرتا۔ چنانچہ اس کے ذہنی فتور اور احکام شریعت سے بیزاری میں اس کی ان کوششوں کا بڑا حصّہ ہے۔

[۲]۔ بدیوانی لکھتے ہیں ــــ دربار میں گجرات کے شہر نوساری کا ایک گروہ بھی پہنچ چکا تھا۔ ان لوگوں نے زردشتی مذہب کو حق بنا کر پیش کیا اور آگ کی تعظیم کو سب سے بڑی عبادت بتلایا۔ کیانی بادشاہوں کے مسلک و روش کی داستانیں سنا کر اپنے عقائد کی طرف مائل کیا۔ چنانچہ اکبر نے حکم دیا کہ جس طرح عجمی بادشاہ اپنے آتش کدے کو ہمیشہ فروزاں رکھتے تھے ہمارے قصر میں بھی شب و روز آگ روشن رہے۔

عیسائی پادریوں کے متعلق لکھتے ہیں ــــ انہی دنوں عیسائیوں کی بھی دربار میں آمد و رفت ہونے لگی۔ ..... جب عیسائی پادریوں پر نگاہِ التفات ہوئی تو انہوں نے انجیل پیش کی اور عقیدۂ تثلیث کے برحق ہونے پر بحث مباحثے کئے

(باقی اگلے صفحہ پر)

عقل پرست بیٹوں نے پوری کر دی، جو مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری اور صدر الصدور شیخ عبدالنبیؒ کے زخم خوردہ تھے اور انہی سے نہیں اسلام سے انتقام لینے پر کمربستہ تھے، جس کے نام پر انہوں نے اس خاندان کو اطمینان اور چین کی زندگی سے محروم کر دیا تھا اور ان کی تیغ خون آشام ان کا لہو چاٹنے کے لیے بے قرار رہتی تھی۔ شیخ مبارک اور ان کے بیٹوں، ابوالفضل اور فیضی نے ان مجالسِ علمی میں دوسرا کام کیا۔ ایک یہ کہ اسلام کے اصول و عقائد میں شکوک و شبہات پیدا کئے۔ ”در ہر رکنے از ارکانِ دین و ہر عقیدہ از عقیدۂ اسلامیہ چہ در اصول و چہ در فروع مثل نبوت و کلام و رویت و تکلیف و تکوین و حشر و نشر شبہات گوناگوں بہ تمسخر و استہزاء آورد“۔ اکبر کی نظر میں ائمہ کرام اور علمائے سلف کو جاہل اور بے وقر ثابت کیا۔ اگر در حینِ بحث سخنِ مجتہدین رامی آورد ندمی گفت فلاں حلوائی و فلاں کفش دوز و فلاں چرم گیر بر ما حجت می آرید“۔ یعنی اگر بحث کے دوران میں مجتہدین کا قول پیش کیا جاتا تو ابوالفضل اس کے جواب میں کہتا کہ کیا تم فلاں حلوائی، فلاں موچی اور فلاں چمڑے والے کے قول سے مجھ پر حجت قائم کرتے ہو۔ اسلام کو بے عقلی کا مجموعہ قرار دیا، جس کے واضع (معاذ اللہ) عرب کے مفلس بدو، رہزن اور مفلس لوگ تھے ـــــ ”ملتِ اسلامیہ ہمہ نا معقول و حادث و واضع آں فقراء عرباں بودند کہ جملہ مفسدان و قطاع الطریق“۔ اس طرح اسلام سے متنفر کرنے کا جو عمل دینِ متین کے نام نہاد سنّوفوں نے شروع کیا تھا۔ اس کو ان باپ بیٹوں نے علمی و عقلی دلائل سے تقویت پہنچا کر پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ اب اکبر ان دلائل کے سہارے، اور خود اس کا اپنا ذہن بھی کچھ کم زرخیز نہ تھا، اہلِ دربار کو اپنا ہم فکر بنانے کی برملا کوشش کرنے لگا۔ بدایونی لکھتے ہیں۔

حاشیہ از صفحہ گذشتہ :۔ بادشاہ نے جو ہمہ تن حق پرستی میں دنیا بھر کی ضلالتوں کا خریدار بنا ہوا تھا۔ انہیں بھی خالی ہاتھ نہ جانے دیا۔ عیسائیت کی تصدیق اور اسے پھیلانے کی ہمت افزائی کی ..... ان ملعون عیسائیوں کی جسارت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے دجالِ ملعون کے اوصاف اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں مشابہت پیدا کرنے سے بھی دریغ نہ کیا (اعاذنا اللہ)

"خلق را جبں صراں و ہوس استحالہ تشکیک در نبوت و امامت امتحان کردند و بود جن و ملک و سائر مغیبات و معجزات و کرامات را انکار صریح آوردند۔ تواتر قرآن و ثبوتِ کلامیت آں و بقائے رُوح بعد از اضمحلالِ بدن و ثواب و عقاب را (غیر از تناسخ) محال می شمردند"۔ یعنی عام مخلوق کو مسئلہ خلقِ قرآن کی تبلیغ کرنا اور وحی میں شک کرنا اور اُسے محال قرار دینا۔ نبوت اور امامت کے مسائل میں ان لوگوں کا امتحان کرنا، جن، فرشتوں اور اسی طرح ساری غیبی ہستیوں، معجزوں اور کراماتوں کا صریح الفاظ میں انکار کرنا۔ قرآن کے تواتر اور اُس کے کلامِ خدا ہونے اور فنائے جسم کے بعد رُوح کے باقی رہنے اور تناسخ کی صورت کے سوا عذاب و ثواب کو محال سمجھتا تھا۔ اسلامی عقائد کی تردید میں اکبر "عقلی دلائل" بھی دیتا۔ مثلاً بھرے دربار میں وہ اپنی ایک ٹانگ پر کھڑا ہو جاتا اور کہتا "ایں معنی را عقل چہ گونہ قبول کند کہ شخصے در یک لحظہ باگرانی جسم از خواب بآسمان رود و نود هزار سخن گو مگوئے با خدائے تعالیٰ کند و بسترش ہنوز گرم باشد و مردم بآں دعوی بگروند۔ ہمہ چنیں شق القمر و امثال۔ (آخر عقل کس طرح مان سکتی ہے کہ ایک شخص اپنے بھاری جسم کے ساتھ ایک لمحے میں آسمان پر چلا جاتا ہے اور نوے ہزار باتیں خدا سے کرتا ہے لیکن واپسی تک اس کا بستر گرم رہتا ہے اور لوگ اس دعوی کو مان لیتے ہیں اور اس طرح شق القمر اور اسی نوعیت کی دوسری باتوں کو مان لیتے ہیں) پھر اپنی اٹھی ہوئی ٹانگ کی طرف حاضرین کو مخاطب کرتا اور کہتا —— "ممکن نیست کہ تا پائے دیگر بر جا ماند استادہ توانیم، ایں چہ حکایت ہاست" جب تک دوسرا پاؤں زمین پر نہ ٹکے میرے لیے کھڑا رہنا ناممکن ہے۔ پھر یہ کیا قصّے کہانیاں ہیں؟ یہ لَے یہاں تک بڑھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک پر بھی طعنہ زنی ہونے لگی۔ قصرِ شاہی میں پانچ وقت اذان اور نماز باجماعت ہوتی تھی، اُسے موقوف کر دیا گیا۔

اسلام کا قتل نامہ

شیخ مبارک اور ان کے بیٹوں نے اکبر کی تعقل پرستی کو غذا فراہم کرنے اور اسلام پر دلیر کرنے کے علاوہ دوسرا کام یہ کیا کہ اس تعقل پرستی کو ایک اجتماعی حیثیت دینے اور ملک کا نظام بنانے کا راستہ کھولا۔ عبادت خانے کے مباحثوں اور تذکروں نے اکبر کو اسلام سے بغاوت تک پہنچا دیا تھا اور وہ تعقل پرستی کے نام پر اسلامی شریعت کو خیرباد کہنے اور اس کی جگہ اپنے دل پسند غیر اسلامی شعائر وافکار و رجحانات کو رائج و شائع کرنے کا خواہشمند تھا۔ چنانچہ ابوالفضل اکبر نامہ جلد سوم میں بادشاہ کے خیالات کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :

"اس سے پہلے جب میں ظاہر بینوں کا ہم خیال تھا۔ میں سمجھتا کہ ظاہر آرائی اور دلی قبولیت کے بغیر مسلمانی کا دعویٰ کرنا فائدہ مند ہے۔ چنانچہ میں کئی ہندوؤں کو ڈرا دھمکا کر اپنے بزرگوں کے دین پر لایا۔ لیکن اب کہ شہرستانِ باطن کی حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس آشوب گاہِ اختلاف میں عقل وفہم کا راستہ اختیار کرنا چاہیئے اور ہیبتِ سلطانی سے زبان پر کلمہ شہادت نکالنا، ختنہ کرانا اور ظاہری قسم کے سجدے کرنا خدا طلبی نہیں ؎

طاعت آں نیست کہ بہ خاک نہی پیشانی

صدق پیش آر کہ اخلاص بہ پیشانی نیست

ضرورت اس کی ہے کہ نفسِ خود آرا کو شکست دی جائے اور خواہش اور غضے کو سلطانِ عقل کے تابع کیا جائے"۔

تاہم امورِ سلطنت و اجتماعیت میں اسلامی شریعت کے ظواہر کو سلطانِ عقل کے تابع بنانے کا متجددانہ اقدام ملی وسیاسی مصلحتوں سے صرفِ نظر کئے بغیر نہ ہو سکتا تھا۔ علماء دربار میں

اپنے تئیں خواہ کتنا ہی بے وقر اور بے وزن ثابت کر چکے تھے عامتہ المسلمین پر ان کا سکہ بدستور رواں تھا۔ نظامِ مملکت کا شریعتِ اسلامی سے متمردانہ انحراف بچوں کا کھیل نہ تھا۔ علمائے کے اثر ورسوخ اور اختیارات کا تو یہ عالم تھا کہ متھرا کے ایک برہمن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں دریدہ دہنی کی۔ اگرچہ بادشاہ اپنی ہندو بیویوں کے زیرِ اثر اس کی رہائی کا خواہاں تھا۔ مگر شیخ عبدالنبی صدرالصدور نے جب بادشاہ سے بار بار استصواب کیا تو وہ یہی کہتا رہا کہ شرعی امور کے تم ذمہ دار ہو مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ چنانچہ شیخ نے اسے قتل کردا دیا۔ اتنے چھوٹے معاملے میں بادشاہ جب بے بسی محسوس کرتا ہو تو پورے نظامِ اجتماعی کی پرانی بنیادیں ڈھا کر اسے نئی بنیادوں پر کھڑا کرنا کہیں مشکل تھا۔ شیخ مبارک مشکل کشا بن کر آگے بڑھا۔ اس نے خود علمائے کے ہاتھوں اسلام کا قتل نامہ تیار کروایا۔ اس طرح دین کے ان اجارہ داروں سے جو کسی نہ کسی بہانے فروعات میں اپنے سے اختلافِ رائے رکھنے والوں کے قتل اور ایذا رسانی کے درپے رہتے تھے اور شیخ خود جن کے فتراکِ ستم کا نخچیر رہ چکا تھا، اپنا انتقام لیا۔ مفاد پرستی کی ہوس اور جوشِ انتقام انسان کو اندھا کر دیتے ہیں، مگر شیخ مبارک نے اس باب میں جو کچھ کیا تاریخ میں اس کی مثالیں شاذ ہی نظر آتی ہیں۔ بے شک شیخ نے انتقام جوئی کی جو راہ اختیار کی وہ انتہائی مذموم تھی، مگر علمائے سو بھی برابر کے مجرم تھے۔ اس دور میں اسلام پر جو کچھ بیتی اس کے لیے وہ قیامت کے روز یقیناً جواب دہ ہوں گے۔

برہمن کے واقعۂ قتل کے بعد جب بادشاہ نے پھر علمائے کے اختیارات کے متعلق ملا مبارک سے بات چیت کی تو ملا نے کہا کہ بادشاہِ عادل، خود امامِ وقت اور مجتہدِ روزگار ہے احکامِ شرعی و ملکی کے اجراء میں وہ اس جماعت کا محتاج نہیں جنہیں جھوٹی شہرت کے سوا علم سے کوئی حصہ نہیں ملا۔ ملا مبارک نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ اجتہاد کا دعویٰ کرے اور اس دعویٰ پر ان علمائے سے محضر نامہ لکھوا لے۔ بادشاہ ذہنی لحاظ سے تو پہلے ہی یکسو ہو چکا تھا اب برہمن کے حادثۂ قتل اور اس کی ہندو بیویوں اور مصاحبوں کی انگیخت نے اسے اس مشورے

پر عمل پیرا ہونے پر آمادہ کر دیا۔ خصوصاً جب کہ اتنا بڑا اقدام اسلام ہی کے نام پر کیا جانے والا تھا؛ چنانچہ خود مُلّا مبارک نے محضر نامہ مرتّب کیا۔ علماء کا ایک اجتماع بلایا گیا جس میں زبردست بحث و تمحیص ہوئی۔ اس محضر نامے کی رُو سے جو اختیارات بادشاہ کو مل رہے تھے ان کے نتائج و عواقب بھی ان کی نظر میں رہے ہوں گے؎۵ تاہم خود علماء کے اپنے طرزِ عمل سے حالات بتدریج ایسی صورت اختیار کر چکے تھے کہ ان کے لیے مزاحمت اور بادشاہ کی مرضی سے سرتابی ممکن نہیں رہی تھی؛ چنانچہ طوعاً و کرہاً انھیں اپنی مہریں ثبت کرنی پڑیں۔

محضر نامہ شیخ مبارک کی ژرف بینی اور علمی و سیاسی ہنرمندی کا شاہکار تھا۔ سب سے پہلے اس میں بادشاہ کے عدل و انصاف اور اس کی بدولت ملک میں پائے جانے والے امن و امان، استحکام اور ترقی کے گن گائے گئے تھے۔ پھر ان علماء کی دیانت، راستبازی اور علم و فضل کی قصیدہ سرائی کی گئی تھی، جنھیں اس اجتماع میں مدعو کیا گیا تھا اور جن کے ہاتھ میں اسلام کے حلقوم پر چلانے کے لیے خنجر دیا جا رہا تھا۔ بعد ازاں قرآن کی آیات اور احادیث کے حوالوں سے سلطانِ عادل کے مراتب اور اس کی اطاعت و نافرمانی کی شرعی حیثیت ظاہر کی گئی تھی اور یہ فیصلہ صادر کیا گیا تھا کہ "مرتبۂ سلطانِ عادل عنداللہ زیادہ از مرتبۂ مجتہد است"۔ (خدا کے نزدیک سلطانِ عادل کا مرتبہ مجتہد کے مرتبے سے زیادہ ہے) اور اس کے بعد "مطلبِ سعدی" بیان کیا گیا تھا:

"بادشاہ جلال الدّین محمد اکبر غازی چونکہ سب سے بڑھ کر عادل عقلمند اور عالم ہیں اس بنا پر وہ ایسے دینی مسائل میں جو مجتہدین کے نزدیک اختلافی ہیں، اپنے ذہنِ ثاقب اور صائب رائے کی روشنی میں بنی آدم کی معاشی سہولتوں اور دنیوی انتظام کی آسانیوں

؎۵ بدایونی لکھتے ہیں کہ اس محضر نامے کا مقصد و منشا یہ تھا کہ بادشاہ امورِ مملکت یا مسائلِ شرعی سے متعلق جو حکم بھی جاری کرے اس سے اختلاف و انحراف کی کوئی شخص جرأت نہ کر سکے اور جو ایسی جسارت کرے وہ اس محضر نامے کی رُو سے خود ہی ملزم قرار پائے۔

کے مدِنظر کسی ایک پہلو کو ترجیح دے کر اسی کو مسلک قرار دیں تو ایسی صورت میں بادشاہ کا یہ فیصلہ "متفقہ" قرار پائے گا اور عام رعایا برایا کے لیے اس کا اتباع لازمی اور لابدی ہوگا۔ نیز اگر بادشاہ کسی ایسی بات کا حکم صادر کریں جو نص کے مخالف نہ ہو تو اس کی تعمیل ہر شخص کے لیے ضروری اور لازمی ہے اور اس کی مخالفت دینی اور دنیوی بربادی اور اخروی مواخذہ کی مستوجب ہوگی۔"

اجتہاد سے نبوّت تک

بظاہر اسلام کی تاریخ میں دین و سیاست کے حادثۂ تفریق کے بعد یہ ایک عظیم الشّان اقدام نظر آتا تھا کہ پھر دین و سیاست کو ایک کر دیا گیا تھا۔ بادشاہ کے حدودِ عمل بھی متعیّن کر دیئے گئے تھے اور قرار دے دیا گیا تھا کہ اس کا دائرہ اجتہاد نصِ قطعی سے متصادم نہ ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں بادشاہ کو نصوصِ قطعیہ کی خلاف ورزی نہ کرنے کا پابند کر دیا گیا تھا، مگر ایک مطلق العنان بادشاہ کو اس قسم کے اختیارات سونپ دینا یوں بھی سخت خطرناک ہوتا ہے یہاں تو یہ اختیارات ایک ایسے شخص کو سونپے جا رہے تھے جو مطلق العنان ہی نہ تھا اَن پڑھ اور جاہل بھی تھا، جو اعتقادی اور ذہنی اعتبار سے اسلام اور نصوصِ شریعت کا باغی ہو چکا تھا اور اسلام کے ساتھ جس کا طرزِ عمل سخت معاندانہ تھا۔ اس محضر نامہ پر جن علماء نے مہریں ثبت کی تھیں ان میں سے اکثر و بیشتر علمائے دربار تھے۔ ان سے اکبر کا فکر و ذہن، اس کے شب و روز اور اس کا معاندانہ طرزِ عمل پوشیدہ نہ تھا۔ ایسے شخص کو اجتہاد کے منصب پر فائز کرنے کے جو نتائج ہو سکتے تھے ان کا اندازہ کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ رہی نصِ صریح کی پابندی تو ایسے علمائے دین کی کسی زمانے میں کمی نہیں رہی ہے جنہوں نے حکمرانوں کی نفس پرستیوں، فکر و نظر کی گمراہیوں اور عملی کج رویوں کو نصوصِ شرعی کا جواز بخشا ہے اور خود اکبر کے عہد میں ایسے حق فراموش و دنیا پرست علماء و مشائخ کی ایک

بڑی تعداد موجود تھی، اس لیے یہ محضر نامہ جن نتائج و عواقب کے پیش نظر مرتب کیا گیا تھا وہی رونما ہو کر رہے۔ اِدھر بادشاہ کی خواہش نفس اور زیغ قلب جسے وہ عقل پرستی کا نام دیتا تھا۔ اجتہاد کا روپ دھارتی اُدھر علمائے سُو اور بندگان دنیا مشائخ و صوفیا اسے شرعی جواز عطا کرنے کے لیے نصوص کا انبار لگا دیتے [1]

ابتدا میں یہ "اجتہادی" سرگرمیاں جزوی امور سے متعلق رہیں، مگر اکبر کا منہ زور اشہب عقل ایک محدود میدان میں زیادہ مدت تک جولاں نہ رہ سکتا تھا، چنانچہ وہ بہت جلد جزوی حدیں پھاند کر "کُلّ" کی چراگاہ میں داخل ہو گیا۔ اب تک بادشاہ کا اجتہاد "تخریب" میں مصروف تھا۔ اب "تعمیر" کا سلسلہ شروع ہوا۔

مجتہد العصر جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی کو خیال آیا کہ عقل و روشنی اور حکمت و دانش جدید کے اس دور میں اسلام (معاذ اللہ) بے عقلی کا مجموعہ ہے۔ یا موجودہ دور کی زبان میں یوں کہنا چاہیے کہ وہ وقت کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس لیے اب ایک دین جدید کی ضرورت ہے، چنانچہ یہ نظریہ تراشا گیا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی مدت عمر کل ایک ہزار سال تھی جو پوری ہو گئی (ہزار سال از کان بعثت پیغمبر اسلام علیہ السلام کہ مدت بقائے ایں دین بود تمام شد) اس نظریئے کی تائید میں آن کی آن میں دلائل کا انبار لگ گیا۔ ایک حضرت مولانا خواجہ شیرازی تھے۔ انہوں نے ایک رسالہ پیش کیا جو وہ مکہ معظمہ کے بعض شرفاء سے لائے تھے۔ اس میں لکھا تھا کہ صحیح حدیثوں میں دنیا کی پوری مدت عمر سات ہزار سال ہے جو

---

[1] لیکن درباری علماء اور مشائخ کی پیش کردہ یہ "نصوص شرعی" عام مسلمانوں کے لیے وجہ اطمینان فراہم کرنے کی خاطر تھیں۔ خود بادشاہ کے نزدیک جو چیز "نص صریح" کا حکم رکھتی تھی بدیوانی اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں — "بر رغم اسلام ہر حکمے کہ ارباب ادیان دیگر بیان می کردند آں را نص قاطع شمردند" یعنی اسلام کے علی الرغم ہر وہ حکم جو کسی دوسرے مذہب کا ہوتا بادشاہ اسے نص قاطع قرار دیتے تھے۔

پوری ہوچکی ہے اور یہی وقت اس مہدیٔ موعود کے ظہور کا ہے - ایک اور درباری مولوی حاجی ابراہیم سرہندی تھے اور صوبۂ گجرات کی صدارت پر فائز تھے - انھوں نے شیخ ابن عربی کی ایک پرانی کرم خوردہ کتاب سے ایک جعلی عبارت نقل کرکے گجرات سے بھیجی، جس کا مفہوم یہ تھا کہ صاحب زماں کے پاس بہت سی عورتیں ہوں گی اور داڑھی منڈا ہوگا - اس نوعیت کی اور صفات جن سے "خلیفۃ الزماں" متصف تھا اس میں درج تھیں - ایک شیعی عالم ملا شریف آملی نے تیموری عہد کے ایک مصنف محمود بسخوانی کی ایک کتاب سے یہ "شہادت" پیش کی کہ ــــــ "نو سو نوے ہجری میں باطل کا مٹانے والا ایک شخص صاحبِ دینِ حق پیدا ہوگا، جمل کے قاعدے سے جس کے نو سو نوے عدد نکلتے ہیں"۔

یہ گویا اس امر کی شہادتیں تھیں کہ ہزار سال کا نظریہ کسی کی ذہنی اختراع نہیں ہے بلکہ ایک امر واقعہ ہے جو پہلے ہی سے مقدر ہوچکا ہے، چنانچہ دینِ نو اور ملتِ جدید کی بنیاد رکھ دی گئی - اس کے عام اعلان و اظہار کے لیے پرانے سکّے گلوا کر نئے سکّے ڈھالے گئے - جن پر "الف تاریخ" لکھی گئی - اسی طرح چند علماء نے ایک کتاب "تاریخ الفی" مدوّن کی - اب یہ "مجتہدِ دوراں" "حریمِ نبوت" میں داخل ہونے کی سعی فرماتے نظر آتے ہیں، اگرچہ صراحتاً نبوت کا نام نہیں لیتے - تاہم ایک بار ایک ایسی عجیب و غریب کیفیت طاری ہوگئی کہ بدایونی کے الفاظ میں جس کی تعبیر ناممکن تھی اور ہر شخص اپنے خیال کے مطابق رائے قائم کرتا تھا اور اسلامی ہند کے طول و عرض میں اس کیفیت سے متعلق گوناگوں قصے مشہور ہوگئے - ملا شیری نے اسی زمانے میں کہا تھا ؎

شورشِ مغزاست اگر در خاطر آرد جاہلے
کز خلائق مہرِ پیغمبر جدا خواہد شدن
بادشاہ امسال دعویٰ نبوت کردہ است
گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

یہ کیسے ممکن تھا کہ خلیفۃ الزمان کی اس "کیفیت" کی تائید میں تاویلات و دلائل پیش نہ ہوتے؟ چنانچہ "صوفی" تاج العارفین کے بارے میں بدایونی لکھتے ہیں کہ خلیفۃ الزمان کو انسانِ کامل قرار دیتے تھے اور اکبر کی ذات کو اس کا مصداق ٹھہراتے اور اس کو بجنسہٖ خدا یا کم ازکم خدا کا عکس قرار دیتے تھے۔ ابوالفضل اکبر کے اس "مقام" کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے —— "جب بنی نوعِ انسان کی خوش نصیبی سے ایسا وقت آجاتا ہے کہ حق پرستی کا دور دورہ ہو تو بادشاہِ دوراں کو ہی پیشوائی جہان معنی بخش دی جاتی ہے جو جلوہ زارِ کثرت میں حدیث کا سررشتہ ڈھونڈ نکالتا ہے۔ اکبر بادشاہ کو یہ مرتبۂ آگہی میسر تھا اور اگرچہ اس نے اپنے آپ کو ایک عرصے تک اس کام سے الگ رکھا لیکن جو مشیتِ ایزدی ہو وہ پوری ہو کر رہتی ہے۔ چنانچہ اب اس نے "راہنمائی" کو رضامندی ایزدی سمجھ کر ہدایت کا دروازہ کھول رکھا ہے اور تشنہ دلوں کو سیراب کر رہا ہے۔"

دینِ الٰہی

نئے دین کی بنیاد رکھ دی گئی، جس کا نام توحیدِ الٰہی قرار پایا۔ وحی والہام یا جو بھی نام دیجئے نازل ہونے لگا۔ اس نئے دین کے کچھ مخصوص اصول وعقائد تھے جو فرنگیوں پارسیوں اور ہندوؤں سے اخذ کئے گئے تھے[۴۷]۔ عبادت صریح شرک پر مبنی تھی۔ صبح، شام، دوپہر اور آدھی رات کو آفتاب اور ستاروں کی

---

[۴۷] بدایونی کہتے ہیں: (آمد ورفت فرنگیاں نیز شد و بعضے اعتقادات عقلی ایشاں را فرا گرفتند) افرنگیوں کی آمدورفت بھی شروع ہو گئی اور بادشاہ نے بعض عقلی اعتقادات ان سے بھی حاصل کئے۔ نیز —— (نواختن ناقوس نصاریٰ وتماشائے صورت ثالث ثلاثہ وبلبلان کہ خوش گاہ ایشاں است وسائر لہو ولعب وظیفہ شد) نصاریٰ سے گھنٹہ بجانے اور ثالث ثلاثہ —— باپ، بیٹا، روح القدس —— کی صورت دیکھنا اور ان کی خوش گاہ بلبلاں اور ایسی دوسری لہو ولعب کی باتیں بادشاہ کا وظیفہ بن گئیں۔ آگ "آیتے است از آیات خدا ونوریست از انوار وے" خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور اس کے انوار میں سے ایک نور۔ قرار پا گئی اور بادشاہ اور اس کے مقربین شمع اور چراغ کے روشن ہونے کے وقت قیام کرنا فرض گردانتے تھے۔ (در افروختن شمع و چراغ قیام لازم می ساختند) اسی طرح قشقہ اور جینو پہنا جانے لگا (قشقہ و زنار را جلوہ داد)

عبادت کی جاتی تھی۔ اسی طرح آگ، پانی، درخت اور تمام مظاہرِ فطرت حتیٰ کہ گائے اور اس کے گوبر تک کو پوجا جاتا تھا۔ آفتاب کو دنیا کا پروردگار اور بادشاہوں کا مربی سمجھا جاتا تھا۔ تناسخ پر یقین راسخ تھا۔ نئے دین کا کلمہ لا الٰہ الاّ اللہ اکبر خلیفۃ اللہ قرار پایا۔ سلام مسنون کے بجائے اللہ اکبر اور جلّ جلالہ کا شعار اختیار کیا گیا۔ خطوط کے سرنامے میں اللہ اکبر لکھا جانے لگا۔ خلیفۃ الزّمان نے اپنے پیروکاروں کے اخلاص و اطاعت کے لحاظ سے چار درجے مقرر کئے، ترکِ مال، ترکِ جان، ترکِ ناموس اور ترکِ دین۔ جو شخص جتنے مدارج طے کرتا اتنے ہی اعزاز و تقرب کا مستحق قرار پاتا۔ ابتدا میں تو نہیں چند سال کے اندر اندر یہ حالت ہوگئی کہ اس دین میں داخل ہونے والے اپنے اقرار ناموں میں اسلام سے بیزاری و برأت کا کھلم کھلا اعلان کرنے لگے۔ؔ خلیفۃ الزّمان کی شبیہ ان کے ہر مومن کے اخلاص و رشد و ہدایت کی علامت کے طور پر اپنی دستار میں رکھنا

ؔ بدایونی رقمطراز ہیں ___ اکثر گمراہ مثلاً مرزا جانی حاکم ٹھٹھہ اور دوسرے مرتد امراء اپنے ہاتھ سے اقرار نامے لکھ کر بادشاہ کے حضور پیش کرتے، جن کا مضمون یہ ہوتا تھا۔ "میں فلاں ابنِ فلاں برضا و رغبت مجازی اور تقلیدی دینِ اسلام سے جسے میں اپنے باپ دادا سے دیکھتا اور سنتا چلا آیا ہوں، انکار کرتا ہوں اور دینِ الٰہی اکبر شاہی میں داخل ہو کر اخلاص و مراتب چہارگانہ یعنی ترکِ مال و جان و ناموس و دین قبول کرتا ہوں"۔

یہ تو "شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ" کا منظر تھا۔ کافروں کی پختہ زنّاری کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب مان سنگھ کو بادشاہ نے اپنے دین کا قلادۂ اطاعت گردن میں ڈال لینے کی دعوت دی تو اس نے بلا تامّل جواب دیا کہ اگر مریدی سے حضور جاں نثاری مراد لیتے ہیں تو ہم اپنی جانیں نچھاور کرنے کے لیے سر ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ کسی اور طرح آزمانے کی حاجت ہی کیا ہے اور اگر اس سے منشا کچھ اور ہے اور اس کا تعلق دین و مذہب سے ہے تو میں اعتقاداً ہندو ہوں۔ ارشاد فرمائیں تو مسلمان ہو جاتا ہوں۔ مجھے خبر نہیں کہ ان دو کے علاوہ تیسرا راستہ کون سا ہے۔

فرض قرار دی گئی۔ بادشاہ کو سجدہ جائز قرار دے دیا گیا۔ داڑھی منڈوانے کے حق میں باقاعدہ ایک فلسفہ تراشا گیا۔

یہ تو اس نئے دین کے عقائد و عبادات اور رسوم و شعائر تھے۔ کوئی بھی دین جسے زندگی مطلوب ہو اجتماعی زندگی کو اپنے دائرۂ اثر میں لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہاں تو اس دین کا مقصد ہی پوری اجتماعی زندگی کا پرانا قالب توڑ کر نیا تیار کرنا تھا؛ چنانچہ اخلاقی، معاشرتی اور اجتماعی شعبوں میں دُور رس اقدامات کیے گئے۔ حلال و حرام اور منکر و معروف کی ایک نئی شریعت وضع کی گئی۔ سود اور جُوا حلال کر دیا گیا اور خود ریاست کی سرپرستی میں "قمار خانہ" قائم ہُوا۔ قمار بازوں کو شاہی خزانے سے سُودی قرض دیا جاتا تھا (ربوا و قمار حلال شد و دیگر محرمات برایں قیاس باید کرد، و قمار خانہ در دربار بنا کردہ درمے بسود بقماراں از خزانہ می دادند) شراب بھی طبّی استعمال کے پردے میں جائز ہو گئی۔ اس شرط پر کہ اس کے پینے سے کوئی فتنہ و فساد اور شور و غوغا نہ ہونے پائے۔ قمار خانے کی طرح ایک شراب خانہ بھی دربار ہی کے قریب کھول دیا گیا اور اس کے نرخ مقرر کر دیئے گئے۔ (دوکان شراب فروشی باہتمام خاتون درباں کہ از نسل قمار است برپا کردہ نرخ معیّن نہادند)۔ علماء، مفتیوں اور قاضیوں تک کو شراب نوشی پر مجبور کیا گیا۔ (در مجالس نوروزی اکثرے علماء و صلحاء بلکہ قاضی و مفتی را نیز در وادیٔ قدح نوشی آوردند)۔

عائلی قوانین جدید خطوط پر وضع کئے گئے۔ چچا، ماموں اور خالہ وغیرہ کی بیٹیوں سے نکاح حرام قرار دے دیا گیا۔ سولہ سال سے کم عمر لڑکے اور چودہ سال سے کم عمر لڑکی کا نکاح ناجائز قرار دے دیا گیا۔ (پسر را بیشتر از شانزدہ سالگی و دختر را از چہاردہ سالگی نکاح روا نہ باشد) [۹] تعدّدِ ازدواج کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ (بیشتر از یک زن نکاح نہ کنند)۔ دلیل یہ کہ —— خدایکے و زن یکے [۱۰] لڑکے اور لڑکی کا کوتوالی میں معائنہ کرائے اور عمر کا صداقت نامہ حاصل کیجے

حاشیہ ۹، ۱۰ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

بغیر نکاح نہ ہو سکتا تھا۔[۱۰] مرد اگر عمر میں عورت سے بارہ سال بڑا ہوتا تو وہ اس کے ساتھ صحبت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک طرف نکاح پر یہ پابندیاں دوسری طرف زنا کو باضابطہ منظم اور قانونی شکل دے دی گئی اور جوا گھر اور شراب خانے کی طرح "شیطان پورہ" کی آبادی شہر سے باہر بنائی گئی جہاں محافظوں اور داروغوں کی نگرانی میں یہ کاروبار باضابطہ انجام پاتا تھا۔ (از شہر بیرون آبادی ساختند و آں را شیطان پورہ نامیدند و آنجا نیز محافظے و شرفے و داروغہ نصب کردند تا ہر کہ باآں جماعت صحبت دادہ یا بخانہ برد اول نام و نسب خود بنویساند آں گاہ باتفاق متغاچیاں جماع ہر چہ خواہد کند) پردہ بھی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ (زنے جواں کہ در کوچۂ و بازاری گردید باشد درآں حال یا رو پنو شد یا روئے کشادہ گردد) اکبر قیدِ نکاح کو بھی ختم کر دینے کے درپے تھا، مگر ہندو جو فوج اور دربار میں مسلمان امراء سے کہیں زیادہ مختار و مقتدر اور بارسوخ تھے، اس پر راضی نہ تھے۔ اس لیے ان کے آگے کچھ پیش نہ گئی۔ عزّت و ناموس اور غیرت و حمیّت کے احساس سے عاری کرنے کے لیے مینا بازار کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ جس میں بیگمات، اہلِ حرم اور خاص و عام پردہ نشین خواتین کو سیر و تفریح کے لیے دعوت دی جاتی تھی۔ بادشاہ بنفسِ نفیس

---

[۹] ابوالفضل جو دینِ الٰہی میں "راہنموئی" کا خلیفہ اعظم تھا، آئینِ اکبری میں بدایونی کی ان الفاظ میں تصدیق کرتا ہے —— و زناشوئی در زن و مرد نارسیدہ و نابالغ نکوھیدہ شمارد۔

[۱۰] ابوالفضل کہتا ہے۔ و افزوں از یک زن بہر کسے نہ پسندد و شورشِ طبیعت و آشوبِ خانہ اندیشد۔

[۱۱] ابوالفضل کہتا ہے اس مقصد کے لیے ایک محکمہ "توی بیگی" قائم کیا گیا تھا جو ایک یا دو ذمّہ دار آدمی دلہا دلہن کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے متعیّن کرتا تھا۔ دو فرہیدہ کم آز برگذارد یکے از حال مرداں پژوہش کند و دیگرے در کارِ زناں بدانی کند و ہر دو را توی بیگی نامند و بسے باشد کہ ایں شغل شگرف بیکے باز گردد۔

اس میلے میں شریک ہوتا لوگوں کو انعام واکرام سے نوازتا، عورتوں کے جھگڑے چکاتا اور لڑکے لڑکیوں کے بر منتخب کرتا تھا۔ ختنہ کی سنّت ختم کرنے کے لیے اس کی حوصلہ شکنی کی گئی اور حکم جاری ہوا کہ بارہ سال سے کم عمر لڑکوں کا ختنہ نہ کرایا جائے۔ بارہ سال کی عمر کے بعد لڑکے کو اختیار ہوگا چاہے کرے نہ کرے۔ اسلام کی ضد میں پہلے یہ فرمان جاری ہوا کہ میّت کو دفن کرتے وقت اس کا منہ مشرق کی جانب اور پاؤں مغرب کی جانب رکھے جائیں۔ پھر حکم نافذ ہوا کہ مردہ کی گردن میں خام غلّہ اور پکی اینٹیں باندھ کر اس کو پانی میں ڈال دیا جائے یا نذرِ آتش کر دیا جائے یا چینیوں کی طرح میّت کو کسی درخت سے باندھ دیا جائے۔

ایک جانب شیر اور بھیڑیئے کا گوشت حلال ٹھیرایا گیا اور دوسری جانب گائے بھینس، گھوڑا، بھیڑ، بکری اور اونٹ کے گوشت کی تحریم کا قانون نافذ کر دیا گیا۔ گاؤکشی پر قتل اور جلاوطنی کی سزائیں دی جانے لگیں۔ اس سلسلے میں یہ حکم بھی ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے آدمی کے ساتھ کھانا کھائے جس کا پیشہ جانور ذبح کرنا ہو تو اس کھانے والے کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اور اگر اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ کھانا کھائے تو اس کی کھانے کی انگلیاں بھی کاٹ دی جائیں[۱۲] مقصود یہ تھا کہ ملک میں قصابوں کے معاشرتی مقاطعہ کی فضا پیدا کر دی جائے اور وہ حلال جانور ذبح کرنے کا کام ترک کرنے پر مجبور ہو جائیں اور مسلمانوں کے لیے ذبیحہ سے محروم ہو جانے کے بعد حرام کھانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔ اسلامی احکام کی ضد میں کُتّے اور سؤر کو پاک جانور قرار دے دیا گیا۔ سؤر کے متعلق، پناہ بخدا، یہ فلسفہ تراشا گیا کہ وہ ان دس مظاہر میں سے ایک ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے حلول کیا ہے۔ کُتّے کے متعلق بعض عارفوں کا یہ قول سند قرار پایا کہ اس میں دس ایسی پسندیدہ صفات ہیں کہ ان میں سے ایک صفت بھی کسی آدمی کو پسند آجائے

---

۱۲ ابوالفضل قصابوں کے ساتھ شکاریوں، غسالوں اور کنّاسوں کو بھی شامل کرتا ہے۔ "قصاب و صیاد و غسال و کناس را از مردم جدا بنگاہ دہد و مردم را از آمیزۂ ایں سنگدلاں و سیہ رواں بر کنار دارد و ہر کہ با جلّاد ہم کاسہ شود بدست او را آسیب رساند و اگر کودج او بانگشت۔"

تو وہ ولی بن جائے۔ غسل جنابت کو منسوخ کر دیا گیا۔ سونا اور ریشم فرضِ عین قرار پایا۔ اسلامی قوانین کے اجراء و نفاذ کو معطل کرنے کے لیے محکمہ قضا ختم کر دیا گیا۔

اوقاف پر قبضہ کر لیا گیا تاکہ منبر و محراب اور خانقاہوں سے حق کا کلمہ بلند نہ ہو سکے جمعہ، عیدین اور اسلامی تقریبات کا اہتمام بھی اکبر نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ شرعی ثبوت کے بغیر عید کا اعلان کر دیا جاتا اور لوگوں کے روزے تڑوا دیئے جاتے۔

یہ تو دینی و اجتماعی زندگی پر تاخت کا منظر تھا۔ اُمتِ مسلمۂ ہند کو اس کے فکری و علمی سرمایہ اور ماضی کی روایات اور تاریخ اور اپنے دین کے سرچشمے سے محروم کر دینے کے لیے پہلے عربی زبان اور قرآن، حدیث اور فقہ پڑھنے پڑھانے کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ بدایونی کے الفاظ ہیں۔ عربی خواندن و دانستن آں عیب شد و فقہ و تفسیر و حدیث و خوانندۂ آں مطعون و مردود (عربی پڑھنا اور عربی جاننا عیب قرار پایا اور فقہ و تفسیر و حدیث کے پڑھنے والے مردود و مطعون گردانے گئے) پھر ایک قدم آگے بڑھ کر دینی و عربی علوم کو حکومت کی سرپرستی سے محروم کر دیا اور آخر کار فرمان جاری کر دیا گیا کہ عربی علوم کا پڑھنا پڑھانا ترک کر دیا جائے اور علومِ نادرہ یعنی نجوم، حساب، طب اور فلسفہ کے سوا اور کوئی علم نہ پڑھا جائے۔ ہر قوم ترکِ علوم عربیہ نمودہ غیر از علوم غریبہ از نجوم و حساب و طب و فلسفہ نخوانند۔ مزید برآں بول چال میں بھی عربی حروف خارج کر دیئے گئے۔ معروف خاصہ زبان عرب مثل ثاء، حاء، عین، صاد، ضاد، طاء، ظاء، از تلفظ برطرف ساختند۔

اثرات و نتائج

بادشاہ کی اس بداعتقادی اور فکر و عمل کی گمراہی اور مخالفِ اسلام اقدامات کے اثرات گوناگوں مفاسد کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ سب سے بڑا مفسدہ یہ تھا کہ دشمنانِ دین اور ملحدین اسلام کی مخالفت میں دلیر ہو گئے وہ علی الاعلان اسلامی عقاید و تعلیمات کی تضحیک

کرتے۔ ان کی دیکھا دیکھی ہندو اور دوسرے غیر مسلم بھی دریدہ دہنی اور یاوہ گوئی کی جسارت کرنے لگے۔ علمائے سُو نے اپنی کتابوں میں نعت کے بجائے تبرّا شروع کر دیا۔ توحید کے ذکر کے بعد بادشاہ کی منقبت لکھنے لگے۔ انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا اسمِ مبارک زبان قلم پر لانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ شعراء اپنے اشعار میں اسلامی شعائر، اسلامی عقائد اور اسلامی افکار کا مضحکہ اڑاتے اور بے خوف و خطر کفر بکتے۔ فیضی کی شاعری اکبر کے افکار کی آئینہ دار اور اس عہد کے ملحدین کی نمائندہ شاعری ہے۔ کعبۂ مقدس پر طنز اور اس کے خلاف زبان درازی اس کے اکثر اشعار کا موضوع ہُوا کرتی تھی۔ ایک جگہ کہتا ہے:-

کعبہ و تعلیم آدابم مکن
گرم رو را فرصتِ احرام نیست
کاروانِ کعبہ شد منزل نشین
رہروانِ عشق را آرام نیست

ایک غزل میں طوافِ کعبہ کو بتوں کی پرستش کے مترادف قرار دیتا ہے۔

آنکہ می کرد مرا منع پرستیدنِ بت
در حرم رفتہ طوافِ در و دیوار چہ کرد

بیت اللہ کو منہدم کر کے اس کی جگہ نئی بنیادوں پر نئی عمارت تعمیر کرنے کی خواہش اس کے اشعار میں اکثر ملتی ہے۔

گر کعبہ شد ویران سہل است کہ عشق از تو
کاخِ دگر افرازد و طرحِ دگر اندازد

وہ اپنے "راھنمونی" اور خلیفۃ الزّمان کی طرح برملا کہتا ہے کہ اسلام کا دَور ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے اب اسلام کے کعبے کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر دین کے نئے تقاضوں کے مطابق نیا کعبہ تیار کرنا چاہیئے۔

بیا کہ روئے بمحرابگاہِ نور نہیم
بنائے کعبۂ دیگر ز سنگِ طور نہیم
حطیمِ کعبہ شکست و اساس قبلہ بریخت
بتازہ طرح یکے قصرِ بے قصور نہیم

ایک اور غزل میں یہی دعوت ان الفاظ میں دیتا ہے :-

گو عشق کہ زنجیرِ درِ کعبہ گدازیم
وز بہرِ پرستش صنمے چند بسازیم
از پردہ درِ کعبہ بریشم بستانیم
بر چنگ بہ بندیم و بمسجد بنوازیم
ویں کعبہ کہ حجاج برافراختہ آں را
انداختہ چوں دیر اساسے بفرازیم
وز سنگِ سیہ مہرہ بسازیم و بمحراب
با مُغ بچگاں شعبدۂ چند بسازیم
پئے کردنِ جنازہ دریں ثواب است
بر قافلۂ کعبہ رواں مست بتازیم
بارم درِ میخانہ بہ از صد عرفات است
ما با ہمہ سازیم و بہ بوالہوس نسازیم

ان اشعار میں اکبر کے الحاد کی رُوح پوری قوت سے بول رہی ہے ایک قصیدۂ فخریہ میں فیضی اپنے عقائد کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے :

شکرِ خدا کہ عشقِ بتاں است رہبرم
در ملتِ برہمن و در دینِ آذرم

اجتماعی زندگی میں اسلام ہی نہیں مسلمان بھی اپنی عملداری میں مظلوم وستم رسیدہ تھے۔ پادری ان کے دین وایمان پر شبخون مار رہے تھے اور ہندوؤں نے ان کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ ریاست کے چھوٹے بڑے مناصب پر انہی کی اکثریت فائز تھی اور وہ مسلمان منصبداروں اور اہل کاروں سے زیادہ با اثر تھے۔ نئے عائلی قوانین کی تشکیل اور مینا بازاروں کے اہتمام سے ازدواجی زندگی کی پاکیزگی اور عفت وشرافت سخت متاثر ہو رہی تھی۔ بدایونی کے بقول ناموسِ غیرت ختم ہو کر رہ گئی تھی اور کوتوالی کے اہلکاروں کی، جن سے دولہا دلہن کی عمر وغیرہ کے صداقت نامے لینے لازم قرار دیئے گئے تھے، خوب بن آئی تھی۔ علاج اور بیماری کے پردے میں شراب نوشی عام ہو گئی اور اس کے نتیجے میں ہنگامہ آرائی اور جھگڑے فساد کی وارداتیں ہونے لگیں۔ بے پردگی اور شیطان پورہ کی آبادی سے زنا اور فواحشات کی ترویج واشاعت کو تقویت ملی۔ علمائے حق کو سرنگوں اور باطل کے آگے سپر انداز کرنے کے لیے معاشی مار دی گئی۔ ان کی زمینیں، وظائف اور معاشی وسائل ضبط کر لیے گئے، ان کے خاندانی اعزاز واعتماد کو مجروح کیا گیا، اس پر بھی ان کی حق پرستی اور استقامت میں فرق نہ آیا تو جلا وطن کر دیا گیا۔ علومِ عربی پر پابندی نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ بدایونی کے الفاظ میں —— مدارس ومساجد ویران و علماء اکثرے جلا وطن شدند واولاد ناقابل ایشاں کہ بماند برور بہ پاجی گیری نام آورند یعنی مساجد اور مدرسے سب ویران ہو گئے۔ اکثر علماء جلا وطن ہو گئے اور ان کی ناقابل اولاد جو پیچھے رہ گئی پاجی گیری میں اس کا شہرہ ہے۔

مخالفت اور مزاحمت

یہ جو کچھ ہو رہا تھا اس پر مسلمانوں کے عوام وخواص میں اضطراب کا برپا ہونا ناگزیر تھا۔ اُمتِ مسلمہ میں گئی گذری حالت میں بھی حق پرستوں اور جرأت مندوں کا قحط نہیں رہا اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ برائی نے سر اٹھایا ہو اور پوری امت نے اسے ٹھنڈے پیٹ برداشت

کر لیا ہو۔ چنانچہ مخالفت کی آوازیں اٹھنے لگیں۔ ابوالفضل اس مخالفت کو ناپاک طینتوں اور یاوہ گوؤں کا جوشِ غضب قرار دیتا ہے۔ وہ ان تاویلات کا بھی ذکر کرتا ہے جو بعض مشہور عوام امور (مثلاً الوہیت و نبوّت وغیرہ) کے بارے میں بادشاہ بطورِ صفائی اپنے حلقۂ خاص میں پیش کیا کرتا تھا، مگر دینِ نو کے جو اثرات اسلامی ہند کی اجتماعی زندگی پر مترتّب ہو رہے تھے، انہیں احساسِ غیرت و حمیّتِ دین سے تہی دامن یا انتہائی بے شعور انسان ہی گوارا کر سکتا تھا۔ چنانچہ جرأت مند اصحابِ علم و دین نے کھل کر مخالفت کی مگر بادشاہ نے ہر مخالفت کو سختی سے کچل دیا۔

جونپور کے شیعہ قاضی القضاۃ ملّا محمد یزدی نے فتویٰ دیا کہ بادشاہ بے دین ہو گیا ہے اور اس پر جہاد واجب ہے۔ یہ وہی قاضی صاحب تھے جنہوں نے اکبر کو صحابۂ کرامؓ سے بدظن کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا، مگر اس وقت یہ نہ سوچا تھا کہ وہ دو دھاری تلوار سے کام لے رہے ہیں۔ اکبر ایسے شخص کا رشتۂ عقیدت صحابۂ کرامؓ سے ان کے اختلافات و مشاجرات کی بنا پر منقطع ہو گا تو وہ علیؓ اور اصحابِ علیؓ پر کیوں ایمان لائے گا جو خود بھی ان اختلافات و مشاجرات میں ایک فریق رہے ہیں اور اس کا عقل بھینسا ایک مرتبہ اپنے کھونٹے سے چھوٹے گا تو پورے دین کو پامال کر کے رکھ دے گا۔ سنّیت کو خاطر میں لائے گا نہ شیعیت کو۔ ایک ایسا ہی فتویٰ بنگالہ کے قاضی القضاۃ معزّ الملک نے دیا۔ اکبر نے ان دونوں کو کسی بہانے دارالحکومت میں طلب کیا۔ جب وہ آگرے سے دس کوس پر فیروز آباد پہنچے تو حکم بھیجا کہ ان دونوں کو الگ کر کے دریائے جون کی راہ گوالیار کے قید خانے میں پہنچا دو۔ پھر ان کو موت کے گھاٹ اتار دینے کا حکم صادر ہوا؛ چنانچہ پہریداروں نے انہیں ایک شکستہ کشتی میں سوار کر کے وسطِ دریا میں گرداب کے حوالے کر دیا۔ قاضی یعقوب مانکپوری نے، جو پہلے ملک کے قاضی القضاۃ رہ چکے تھے اور اب بنگالہ کے قاضی تھے، متعہ کے خلاف فتویٰ دیا تھا، انہیں بھی طلب کیا گیا اور قلعۂ گوالیار میں محبوس کرنے کا حکم ہوا لیکن راستے ہی میں عدم آباد پہنچا دیے گئے۔

شیخ سلیم چشتیؒ کے صاحبزادے شیخ بدر الدین، جن کا بادشاہ عقیدت مند بھی تھا، شاہی

نوکری سے مستعفی ہو کر گھر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے، اکبر نے انہیں دربار میں بلوا کر سمجھایا مگر ہر ملاقات میں کشیدگی بڑھتی گئی۔ انہوں نے اس دینِ جدید کے رسوم و شعائر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ حکومت انہیں جور و ستم کا نشانہ بنانے لگی۔ آخر تنگ آکر چپ چاپ مکّہ معظّمہ ہجرت کر گئے۔ اور وہیں کعبے کی دیوار کے نیچے اپنی جان جان آفرین کے حوالے کر دی۔ مخدوم الملک اور صدر الصدور جنہوں نے مُلّا مبارک اور ابو الفضل کے ہاتھوں اپنے گرتے ہوئے وقار کو سنبھالنے کے لیے ہر معاملے میں اکبر کی تائید و حمایت کی تھی، مگر "دینِ جدید" کی گولی ان کے حلق سے بھی نہ اتر سکی۔ انہیں ۱۵۷۹ء کے اوائل میں حج پر بھیج دیا گیا اور حکم ہوا کہ بلا اجازت واپس نہ آئیں۔ بالفاظِ دیگر انہیں حج کے بہانے جلاوطن کر دیا گیا۔ جب بادشاہ کے خلاف عام برہمی اور مسلح بغاوت پھیلی تو یہ دونوں حضرات واپس آگئے، مگر یہاں رنگِ فلک ہی اور تھا۔ بغاوت کچلی جا چکی تھی۔ مخدوم الملک تو مارے ڈر کے گجرات ہی میں جان ہار گئے۔ شیخ عبد النبی پابجولاں حاضر کیے گئے۔ بادشاہ سخت بدزبانی سے پیش آیا۔ بھرے دربار میں منہ پر تھپڑ مارا اور پھر جیل میں ڈال دیا۔ جہاں ایک مدّت تک ان سے ستر ہزار روپے کا حساب لیا جاتا رہا جو انہیں مکّہ معظّمہ میں خیرات کے لیے دیا گیا تھا، اسی دوران میں ابو الفضل نے بادشاہ کے اشارے پر ان کا گلا گھٹوا کر مروا ڈالا۔ علمأ کی قوت توڑنے کے لیے انہیں دور دراز کے علاقوں میں منتشر کر دیا گیا۔ جن مشائخ، علماء، فقرا اور مرشدوں کے متعلق خبر ملتی کہ وہ عوام کی توجّہ اور عقیدت کا مرکز بنے ہوئے ہیں انہیں مختلف قلعوں میں قید کر دیا جاتا جہاں وہ مدّتوں مصائب و شدائد جھیلتے رہتے۔ عوام میں ان کا وقار و احترام زائل کرنے کے لیے ان پر گوناگوں اخلاقی الزامات عائد کیے جاتے۔ قاضی جلال الدّین ملتانی انہی میں سے ایک تھے۔ حق پرست اور حق گو۔ اکبر کی بے دینی کا بڑی ثابت قدمی سے مقابلہ کیا۔ اکبر نے ان پر جعلی تمسک لکھ کر خزانۂ شاہی سے پانچ لاکھ تنکہ وصول کر لینے کا الزام لگایا اور دکن کی طرف جلاوطن کر دیا۔ سلطنت کے دور دراز گوشوں سے علمائے حق دربار میں بلوائے جاتے اور انہیں غیر شرعی مراسم بجا لانے اور مسکرات پینے پر مجبور کیا جاتا اور اگر وہ انکار کرتے، تو ملک سے اخراج کا

حکم صادر کر دیا جاتا۔

دوسری طرف فسّاق و فجّار کو دینی مناصب پر فائز کیا گیا۔ قاضی عبد السّمیع ماوراء النّہری فاسق و فاجر اور قمار باز تھا، کھلے بندوں شراب پیتا تھا، رشوت خوری تو گویا اس کے مذہب میں فرضِ عین تھی۔ سودی لین دین بھی کرتا تھا۔ حاجی ابراہیم سرہندی نے اپنے حرم میں چار سے زائد عورتیں ڈال رکھی تھیں اور ائمّہ سے رشوت لے کر بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔

یہ عام برہمی مشرقی اضلاع بہار اور بنگال میں مسلح بغاوت کی شکل بھی اختیار کر گئی جس پر بصد مشکل قابو پایا گیا۔ اکبر کو معزول کر کے اس کے سوتیلے بھائی مرزا محمد حکیم حاکمِ کابل کو ہندوستان کا بادشاہ بنانے کی پخت و پز بھی ہوئی، مگر یہ کوشش بھی ناکام رہی۔

اب اس "دینِ جدید" کی مزاحمت کرنے والا ایک محدود حلقہ رہ گیا اور یہ ان چند مسلمان امراء پر مشتمل تھا جنھوں نے ہر خطرہ مول لے کر اس دین کی خرافات پھیلنے سے روکنے کی جدّ و جہد کی۔ انہی میں اکبر کا رضاعی بھائی خانِ اعظم مرزا عزیز کوکہ تھا، جو ایک لائق جرنیل تھا اور جس نے اضلاعِ مشرقی کی بغاوت فرو کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس نے اکبر کو بار بار سمجھایا اور راہِ راست پر لانے کی کوشش کی، مگر جب وہ نہ مانا تو ہندوستان چھوڑ کر مکّہ معظّمہ کی راہ لی۔ وہاں سے ایک مفصّل خط میں اسے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

"جمعے کہ خاطرِ اشرف را از دینِ محمدیؐ بیگانہ و مجتنب می سازند حاشا کہ دوست باشند...... کارِ دنیا بازیچۂ ایست ناپائیدار۔ حرفِ دوسہ خوشامد گوئے آخرت بدنیا فروش اعتبار نباید کرد...... پیش ازیں سلاطین بودہ اند کہ ہمہ صاحبِ تمکین بودند۔ ہیچ بادشاہے را دغدغہ نہ شد کہ دعوئے پیغمبری و نسخِ دینِ محمدیؐ نماید"۔

جن لوگوں نے حضور والا کے دل کو دینِ محمدی سے بیگانہ اور مجتنب کر دیا ہے وہ آپ کے مطلقاً خیر خواہ نہیں ہیں..... دنیا کا معاملہ ایک ناپائیدار کھیل تماشے کا سا ہے۔ دنیا کے بدلے آخرت بیچنے والوں کی خوشامدانہ باتوں کا اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔ پہلے

بھی زور قوّت اور شان و شوکت والے بادشاہ گذر چکے ہیں۔ ان میں سے کسی بادشاہ کو بھی نبوّت کا دعویٰ کرنے اور دین محمّدی کو منسوخ کرنے کا خیال نہیں آیا"۔

ایک اور امیر قطب الدّین محمّد خاں آتکہ، شہزادہ سلیم کے اتالیق تھے جو دینِ حق کی تائید و حمایت بڑی جرأت سے کرتے تھے۔ ایک دن اکبر نے انہیں اپنے نئے دین میں داخل ہونے کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: دوسرے ملکوں کے بادشاہ شلاً رُوم کے اخوند کار (سلطان ترکی) وغیرہ ایسی باتیں سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ سبھی دینِ اسلام پر ایمان رکھتے ہیں، خواہ تقلیدی ہو یا کچھ اور۔ انہوں نے تو ایک بدیہی بات کہی تھی مگر اکبر بہت برسا اور الزام لگایا کہ تم اخوند کارِ رُوم کے دربار میں اعزاز و مرتبہ حاصل کرنے کے خواہشمند ہو۔ ایک اور امیر شہباز خاں کنبوہ تھے۔ بڑے ہی حق گو اور حمیتِ دین میں گرم جوش۔ ایک دن بیربل نے بھرے دربار میں ارکانِ اسلامی کا تمسخر اڑایا تو ان سے نہ رہا گیا۔ بے ساختہ بول اٹھے: "اے کافر ملعون! تو ہم ایں چناں سخناں می گوئی"۔ اے ملعون کافر! تجھے بھی ایسی یاوہ گوئی کی جسارت ہوگئی ہے۔ اپنے عزیز از جان مخلص "مرید" کی شان میں یہ گستاخانہ کلمات سن کر اکبر بھڑک اٹھا اور کہنے لگا: چپ رہو ورنہ ہم تمہارے منہ پر نجاست بھری جوتیاں لگوانے کا حکم دیں گے۔ شہباز خاں کو اسی نوعیت کی گستاخیوں کی پاداش میں قید و بند کا شکار بھی ہونا پڑا۔ ایک اور امیر قلیج خان تھے۔ مختلف صوبوں کے صوبیدار رہے۔ لاہور کی گورنری کے دوران میں ہر روز مدرسہ میں جاکر تین گھنٹے قرآن و حدیث اور فقہ کا درس دیتے تھے۔ عیسائی مشنریوں سے انہوں نے وہ ساری مراعات چھین لی تھیں جو اکبر نے انہیں دی تھیں۔ پھر عبدالرّحیم خانخاناں اور شیخ فرید تھے، مگر ان سب کی کوششیں ایک محدود دائرے کے اندر تھیں جو روز بروز تنگ ہوا جاتا تھا۔ پھر یہ مزاحمت بھی کمزور پڑتی جاتی تھی۔ منصب و اقتدار کے پجاری اور مفاد پرست ہمیشہ پائے گئے ہیں۔ پھر اقتدار کا دباؤ، دربار کی فضا اور ماحول تھا، جہاں ابناء الوقت کا ہجوم تھا، ان سب کے درمیان کسی شخص کا اپنے موقف پر ثابت قدم رہنا اور اپنے ایمان کو سلامت رکھنا بڑی ہمّت اور عزیمت

کا کام تھا۔ چنانچہ ان امراء میں سے بھی ایک ایک چھٹتے جاتے تھے۔ خانِ اعظم ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ غریب الوطنی کی پریشان حالی اور وہاں کے حکام کے سلوکِ ناروا نے انہیں وطن آنے پر مجبور کر دیا۔ وہ آئے اور آتے ہی بادشاہ کے "سلسلۂ مریداں" میں داخل ہو گئے ۱۵۹۴ء، تقریباً دو سال بعد میراں صدر جہاں اور مُلا شیری نے بھی اس "دینِ جدید" کا قلاوۂ طاعت اپنی گردنوں میں ڈال لیا اور یہ ملا شیری وہی ہیں جنہوں نے ایک عرصہ پہلے کہا تھا۔

بادشاہ امسال دعوائے نبوّت کردہ است
گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

حضرتِ مجددؒ مطلعِ تاریخ پر

یہ تھا وہ پُر آشوب منظر، جس میں حضرتِ مجددؒ اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ ۱۵۷۹ء میں جب اسلام اور ملتِ مسلمہ کے قتل نامے کا اعلان ہوا، حضرتِ مجددؒ پندرہ برس کے تھے۔ ۱۵۹۹ء میں آپ خواجہ باقی باللہؒ سے بیعت ہوتے ہیں۔ یہ سارا عرصہ حصولِ علم اور سلوک و طریقت کی راہیں طے کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ بیعت کے وقت جن علمی فضل و کمال اور رُوحانی عظمت و استعداد سے بہرہ مند ہو چکے تھے اس کا اندازہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے اس مکتوب سے ہو سکتا ہے جو آپ نے ایک دوست کے نام تحریر کیا تھا۔ فرماتے ہیں:

"شیخ احمد نام مردیست از سرہند۔ کثیر العلم و قوی العمل۔ روزے چند بافقیر نشست و بر خاست کرد، عجائب بسیار از روزگار اوقات او مشاہدہ نمود۔ بآں ماند کہ چراغے شود کہ عالمہا ازو روشن گردد"۔

یعنی سرہند کا ایک شخص شیخ احمد نامی ہے "کثیر العلم اور قوی العمل۔ چند دن فقیر کی صحبت میں رہا، اس کے عجیب و غریب کمالات مشاہدے میں آئے، امید ہے کہ وہ ایسا چراغ ہوگا جس سے تمام جہان منور ہو جائے گا۔

مرید کے ان کمالات کے اعتراف کی روشنی میں شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بعیت کے فوراً بعد حضرت خواجہ رح اپنی طرف رجوع کرنے والوں کو شیخ مجددؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دینے لگے ہوں گے۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ ان کی خرابیٔ صحت زیادہ مشاغل کی متحمل نہ تھی۔ تاہم اس باب میں کوئی واضح خارجی شہادت نظر سے نہیں گذری۔ البتہ خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مکتوب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بعیت کے دو تین سال بعد حضرتِ مجددؒ سلوک و طریقت کی تعلیم دینے لگے تھے۔ میراں صدر جہاں ۲-۱۶۰۱ء کے لگ بھگ خواجہ باقی باللہ رح کی بعیت کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور حضرت خواجہ رح انہیں حضرتِ مجدد کے سپرد کر دیتے ہیں۔ حضرتِ مجددؒ کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

" جناب صدرِ جہان نے ذکر و مراقبہ سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ذکر تو بتلا دیا گیا لیکن چونکہ اس گروہ کا خاص مراقبہ درس اور بیان کی قسم سے نہیں ہے اور ان کا ارادہ بھی یہی تھا، اس لیے یہی مناسب دیکھا گیا کہ آپ کی خدمت میں اس کی صحت کرے ...... اب فقیر پر ضعف بہت غالب ہے۔ صحبت کی فرصت اور توجہ کی طاقت نہیں رہی۔"

پھر اس سال حضرتِ مجددؒ کو ارشاد و ہدایت کا کام باقاعدہ تفویض کرتے ہیں۔ ۱۶۰۳ء میں خواجہ باقی باللہ رح وصال فرماتے ہیں اور حضرتِ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مرجعِ خلائق بن جاتے ہیں۔

حضرتِ مجددؒ گذشتہ ۴۰ برس سے ملک و ملت کے تاریک شب و روز اور اجتماعی زندگی میں رُونما ہونے والے تغیرات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ قدرت نے انہیں فطرتِ حساس، دلِ دردمند، حمیتِ دینی اور فکرِ راست سے بدرجۂ اتم بہرہ ور فرمایا تھا۔ پھر وہ ایک بے بدل عالمِ دین بھی تھے۔ کتاب و سنت ایک عالمِ دین پر جو فرائض عائد کرتے ہیں ان سے آگاہ ہی نہ تھے ان کا احساس بھی رکھتے تھے اور کتاب و سنت کی روشن و واضح تعلیمات نے ان پر وہ ساری خرابیاں اور کمزوریاں اور ان کے اسباب و علل آشکارا کر دیئے تھے جن میں اس وقت ملتِ اسلامیہ

ہند مبتلا تھی۔ ان جیسا دلِ سیماب صفت رکھنے والا فرض شناس عالمِ دین اور پیرِ طریقت اطمینان اور بے فکری سے مسندِ درس و تدریس اور سجادۂ مشیخت پر بیٹھا اس اضطراب انگیز منظر کا بے بس تماشائی بنے رہنے پر اکتفا نہ کر سکتا تھا۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی طرف سے مسندِ ارشاد و ہدایت پر فائز ہونے سے پہلے حضرتِ مجددؒ کے شب و روز کا جو ذکر آپ کے تذکرہ نگاروں نے کیا ہے، ان میں زیادہ تر آپ کے علمی و تدریسی مشاغل اور سلوک و طریقت سے متعلق معمولات کا پتہ چلتا ہے۔ مسندِ جہانگیر میں آپ نے سیاسی میدان میں جو کارنامۂ تجدید انجام دیا، اُس کے ابتدائی آثار کا ذکر تو در کنار شرک و بدعت اور ویدانتی تصوّف کے خلاف جہاد کے سلسلے میں بھی کوئی خاص تذکرہ نہیں ملتا۔ تاہم مکتوبات کے آئینے میں نظر آنے والے حضرت مجدّدؒ ایک ہی دن میں تو نہیں بن گئے تھے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تحصیلِ علم کے بعد مشغلۂ درس و تدریس کے آغاز سے حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی جانب سے مسندِ ارشاد و ہدایت پر متمکّن کیے جانے تک حضرت مجدّدؒ، خواہ ایک محدود دائرے ہی میں سہی، اس کام کی طرف کسی نہ کسی شکل میں ضرور متوجّہ رہے ہوں گے[۳۱]۔

۳۱ے تحصیلِ علم اور مسندِ درس و تدریس پر متمکّن ہونے کے بعد حضرتِ مجدّدؒ اکبرآباد تشریف لے گئے تھے، جو ان دنوں دارالسلطنت تھا اور ایک مدت تک وہیں مقیم رہے تھے۔ اس قیام کے دوران میں چند واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے حضرتِ مجدّدؒ کے ان ابتدائی دنوں میں اُن کی غیرتِ دینی اور دفاعِ حق کی تڑپ کا پتہ چلتا ہے۔ حضرتِ مجدّدؒ ابوالفضل کی مجلس میں بالعموم جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کی موجودگی میں ابوالفضل نے فلسفیوں اور ان کے علوم کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے اور علمائے اسلام کو بے وقر اور جاہل ثابت کرنا شروع کر دیا۔ حضرتِ مجدّدؒ سے نہ رہا گیا۔ فرمایا کہ امام غزالیؒ نے اپنی کتاب المنقذ عن الضّلال میں لکھا ہے کہ فلسفی جن علوم کی ایجاد کا دعویٰ کرتے ہیں ان میں سے جو کام کے علوم ہیں مثلاً ہیئت، نجوم، طب وغیرہ، وہ انہوں نے انبیائے قدیم کی کتابوں اور ان کے کلام سے چُرائے ہیں اور جو ان کی اپنی ایجاد ہیں مثلاً ریاضی وغیرہ وہ دینی نقطۂ نظر سے بیکارِ محض ہیں۔ ابوالفضل نے فرطِ جوش (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

مکتوبات حضرت خواجہؒ سے بیعت ہونے کے بعد لکھے گئے اور ان میں حضرت مجددؒ کی زندگی کا دعوتی اور تجدیدی رُخ بے نقاب نظر آتا ہے۔ ان کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے کہ حضرت مجددؒ نے وہ کیا کارنامہ انجام دیا جس سے ان کا نام اسلامی ہند کی دینی و سیاسی تاریخ میں زندۂ جاوید ہوگیا۔

سیاسی کام

حضرتِ مجددؒ کا یہ کام سہ جہتی تھا۔ یعنی ایک طرف آپ نے کتاب و سنّت کی دعوت دی اور شرک و بدعات کے خلاف جدّوجہد کی، دوسری طرف علمائے سُو کے فتنوں کے خلاف محاذ کھولا اور تصوّف کو عجمی خرافات سے پاک صاف کرنے کی کوشش کی اور تیسری طرف اقتدار کا رُخ بے دینی سے موڑنے اور اکبر کے بنا کردہ دینِ جدید کو ختم کرنے کی سعی وجہد کی۔ چونکہ ہمارے اس مضمون کا تعلق مؤخرالذکر موضوع سے ہے اس لیے ہم اپنے سلسلۂ بیان کو اسی تک محدود رکھیں گے۔

حضرتِ مجددؒ کے مکتوبات کا بنگاہِ غائر جائزہ ظاہر کرتا ہے کہ خواجہ باقی باللہؒ کی بیعت کے بعد جلد ہی آپ مرجعِ خواص و عوام بن گئے تھے، اور اس میں خود مرشد کی کوششوں کا دخل

(حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) میں کہہ دیا کہ غزالی نے نامعقول بات کہی ہے۔ حضرتِ مجددؒ کو نہایت ناگوار گذرا۔ فوراً اس کی مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا "اگر اہلِ علم کی صحبت کا شوق ہے تو اس طرح بے ادبی کے الفاظ زبان سے نہیں نکالنے چاہئیں۔ پھر کئی روز تک اس کی مجلس میں نہ گئے۔ حتیٰ کہ اس نے آدمی بھیج کر معذرت طلب کی اور انہیں بلا بھیجا۔ اسی زمانۂ قیام میں انھوں نے "ردِّ روافض" ایک رسالہ مشہد کے علمائے شیعہ کے رسالے کے جواب میں تحریر کیا، جس کا چرچا ہندوستان کے امراء اور سلاطین کی مجلسوں میں بڑے فخر و ناز کے ساتھ ہو رہا تھا۔ حضرتِ مجددؒ ان محفلوں میں اس رسالے کی زبانی تردید بھی فرماتے رہے تھے۔ بعد ازاں افادۂ عام کے لیے مستقل رسالہ قلمبند فرما دیا۔

بھی تھا جو اپنے دوستوں اور عقیدت مندوں کو یہ کہہ کر ان کی جانب متوجہ کرتے تھے کہ شیخ احمد ایک ایسا چراغ ہے جس سے سارا جہاں منور ہو گا اور جو لوگ ان کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوتے تھے انہیں اس مرید کے سپرد کرتے تھے۔ حضرت خواجہؒ کے ارادت مندوں میں اکبر کے متعدد درباری بھی تھے۔ حضرت مجددؒ کے مکتوبات کے تینوں دفاتر میں ان کے نام بہت سے خطوط ملتے ہیں۔ انہی خطوط سے اس جدوجہد کا پتہ چلتا ہے۔ جو حضرت مجددؒ نے اسلامی ہند میں اسلام کی غربت و بیکسی کو ختم کرنے کے لیے کی۔ ہمارے دور کے بعض تذکرہ نگار جب حضرت مجددؒ کے اس سیاسی کارنامے کا ذکر سنتے ہیں تو وہ اسے ایک "محلِ نظر" دعویٰ قرار دیتے ہیں۔[۵۵]

انہیں چونکہ حضرت مجددؒ صرف وعظ و نصیحت کا آسان[۵۵] کام کرتے اور عمل پیرائی کا مشکل کام امرائے دربار کے حوالے کرتے نظر آتے ہیں اس لیے اکبری الحاد کے خاتمے کا کریڈٹ وہ حضرت مجددؒ کو دینے پر تیار نہیں ہیں۔ غالباً ان کے نزدیک حضرت مجددؒ کے سر یہ سہرا اسی وقت بندھتا جب آج کی اصطلاح میں کوئی منظم دینی یا سیاسی تحریک اٹھاتے، خود اس کی قیادت فرماتے اور عوام و خواص کو مجتمع کر کے اقتدار کے خلاف صف آرا ہو جاتے۔ حالانکہ مطلق العنان شخصی حکومتوں اور بادشاہتوں میں ایسا کبھی ممکن نہیں رہا ہے۔ ایسی حکومتوں میں اصل قوت عوام نہیں ہوتے (بلکہ عوام تو سرے سے کوئی قوت ہی نہیں ہوتے) اصل قوت خود حکمران طبقہ ہوتا ہے یا ثانوی قوت اس طبقے کے امراء، مصاحبین اور عمال کی ہوتی ہے۔ اصل قوت کو ضلالت اور بے دینی کی راہ سے اگر موڑا جا سکتا ہے تو اسی ثانوی قوت کے ذریعے۔ کیونکہ حکمرانوں کا تخت اقتدار اسی (ثانوی قوت) کے بل بوتے پر قائم ہوتا ہے! چنانچہ مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ شخصی استبداد کے طویل دور میں علمائے امت نے اصلاحِ اقتدار کا بالعموم وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو حضرت مجددؒ نے کیا۔ یعنی سلطنت کے اعیان و امراء میں دین کا شعور پیدا کیا اور ان کے دلوں میں غیرت و حمیت

---

[۵۵] رودِ کوثر از شیخ محمد اکرام پی سی ایس۔ ص ۲۳۴

[۵۵] ؛ [۵۶] ایضاً ص ۲۳۲

دین کی آگ روشن کی اور پھر ان کے ذریعے اصلاحِ احوال کی سعی کی۔[1]

حضرتِ مجددؒ نے پہلا کام یہ کیا کہ انھوں نے اپنے ارادت مند امرائے دربار کی فکری اور شعوری تربیت کی۔ ان کے اندر اسلام کی تعلیمات سے آگاہی حاصل کرنے، اسلام کو اپنی عملی زندگی میں اپنانے، معروفات پر عمل پیرا ہونے اور منکرات سے بچنے کا شعوری جذبہ ابھارا۔ بے شک یہ حضرات خواجہ باقی باللہؒ کے مخلصین میں تھے اور ان سے اکتسابِ فیض کیا تھا۔ شاہی دربار میں پھیلی ہوئی بے دینی کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں امید کی کرن تھے تو یہی، مگر ان کا یہ رنگ قلب و باطن کے تزکیے کا مرہونِ منت تھا جس کے لیے عقلی و علمی استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی اور دربار میں جو جنگ درپیش تھی اس کے لیے عقلی اور علمی اسلحہ درکار تھے۔ درباری علماء نے اپنے حریفوں سے کردار کے میدان ہی میں نہیں علم واستدلال کے میدان میں بھی شکست کھائی تھی۔

یہ تربیتِ فکر و شعور اور تطہیرِ کردار و عمل کس انداز کی تھی۔ ذیل کے آئینے میں اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ حضرتِ مجددؒ کے دور کا ایک بڑا فتنہ شریعت کے ظاہری احکام پر باطن کی سعادت کو ترجیح دینا تھا۔ اس فتنے سے صوفیا ہی نہیں عام لوگ اور امراء تک متاثر تھے۔ شریعت پر عمل ترک ہو چکا تھا۔ منکرات فروغ پذیر تھیں جس سے ان کے اندر اکبر کے دینِ جدید کے تحت رونما ہونے والے اجتماعی تغیرات کا مقابلہ کرنے کی نہ سکت رہی تھی اور نہ ان کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت ہی تھی۔ حضرتِ مجددؒ نے اپنے مکتوبات میں اپنے ارادت مندوں کو نہ صرف باطنی سعادت مندی کی اصل حقیقت و اہمیت بیان کی بلکہ شریعت کے ظاہری احکام کی اطاعت اور انہیں عملی زندگی میں اپنانے

---

[1] لطف یہ ہے کہ جس طرح بعض اصحابِ فکر و نظر شخصی حکومتوں میں آج کے جمہوری دور کے طرز پر تحریک چلائے بغیر کسی کام کو "کام" تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے اسی طرح بعض دوسرے اصحابِ علم و فکر آج کی جمہوری حکومتوں میں بھی جہاں اصل قوت حکمران نہیں ملک کے عوام ہوتے ہیں، یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ دینی کام اسی طرز پر ہونا چاہیئے جس طرز پر کہ علمائے امت مطلق العنان شخصی حکومتوں کے سائے میں کرتے رہے ہیں یعنی جمہوری ظل اللہوں اور ان کے امراء و مصاحبین کو وعظ و نصیحت اور بس۔

کی بھی تلقین کی۔ شیخ فرید کو جو اکبر کے با اثر امرائے دربار میں سے تھے، تحریر فرماتے ہیں۔

"حق تعالیٰ آپ کو ظاہری دولت اور باطنی سعادت سے نوازے۔ فی الحقیقت ظاہری دولت یہ ہے کہ اپنے ظاہر کو شریعتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلّم کے رنگ میں رنگ دے اور باطنی سعادت یہ ہے کہ اپنے باطن کو ماسوا اللہ کی گرفتاری سے آزاد کیا جائے۔ دیکھیں کون خوش نصیب ان دونوں عظمتوں سے مشرّف ہوتا ہے۔ ع

کار ایں است و غیر ایں ہمہ ہیچ" [۱۸]

ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں:

"دیکھئے کس خوش نصیب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنّت کی اتّباع سے نوازا اور حضور کی پسندیدہ شریعت کی پیروی سے سرافراز کیا جاتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے دین کی صداقت پر ایمان لانے کے بعد تھوڑے سے عمل کی بجا آوری بھی عمل کثیر کے برابر ہوتی ہے..... مثلاً اگر سپاہی دشمنوں اور مخالفین کے غلبے کے وقت تھوڑا سا فکر و تردّد بھی کرتے ہیں تو زمانۂ امن کے مقابلے میں اسے کئی گنا مقامِ اعتبار حاصل ہو جاتا ہے" [۱۹]

خواجہ جہان کو لکھتے ہیں:

"دینوی معاملات میں شریعتِ روشن کی پیروی کرنی چاہیئے۔ کھانے پینے اور رہنے سہنے میں شرعی حدود کو مدّنظر رکھنا چاہیئے اور ان حدود سے متجاوز نہیں ہونا چاہیئے۔ مال و دولت اور چوپایوں کی زکواۃ ادا کرنی چاہیئے جو اللہ نے فرض کر دی ہے اور جب زندگی احکام شرعی سے آراستہ پیراستہ ہوگی تو دنیا کی تکالیف سے نجات مل جائیگی اور دنیا و آخرت ایک ساتھ مل جائیں گے" [۲۰]

---

[۱۸] مکتوب ۴۹ دفترِ اوّل

[۱۹] مکتوب ۵۰ دفترِ اوّل

[۲۰] مکتوب ۲، دفترِ اوّل

عبدالرحیم خانخاناں کو لکھتے ہیں :

"ہمیں اپنی چند روزہ زندگی صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلّم کی اتّباع میں گذارنی چاہیئے۔ عذابِ آخرت سے بچنے اور ابدی نعمتوں سے ہمکنار ہونے کا انحصار اسی اتّباع واطاعت پر ہے۔ پس مال و دولت اور مویشیوں کی زکواۃ پوری پوری ادا کرنی چاہیئے اور بجز اطاعتِ رب اور کوئی مقصد نہیں ہونا چاہیئے۔ کھانے پینے کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ادائے اطاعت کے لیے قوّت حاصل ہو۔ نفیس کپڑے پہننے سے خذوا زینتکم عند کل مسجد کے سوا اور کوئی مقصود نہ ہونا چاہیئے.....
علیٰ ہٰذا القیاس ہر معاملے میں ان علمائے حق کے فتوے کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیئے جنہوں نے رخصت سے گذر کر راہِ عزیمت اختیار کی اور اسی (عزیمت) کو وسیلۂ نجات بنانا چاہیئے۔"[۱]

اس سلسلے میں متنبّہ فرمایا کہ اتّباعِ شریعت کی زندگی کسی ناقص سالک سے نہیں ملے گی۔ عبدالرحیم خانخاناں کو لکھتے ہیں :

"اے بھائی! جان لیجئے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ حیف ہے اس شخص پر جس نے اس کھیتی میں کچھ نہ بویا، اپنی فطری صلاحیتوں کی زمین کو بے کار رہنے دیا اور اپنے اعمال کے بیج ضائع اور برباد کر دیئے، اور زمین دو طریقے سے ضائع اور بیکار جاتی ہے۔ اوّل یہ کہ اس میں کاشت نہ کی جائے۔ دوسرا یہ کہ اس میں ناپاک اور خراب بیج ڈالا جائے، اور ضیاع و بربادی میں یہ دوسری قسم پہلی قسم سے زیادہ مُضر اور فساد انگیز ہوتی ہے۔ بیج کے ناپاک اور خراب ہونے سے مراد یہ ہے کہ ناقص سالک سے طریقہ اخذ کیا جائے اور اس کی راہ پر گامزن ہوا جائے۔ کیونکہ ناقص سالک حرص و ہوا کا متبع ہوتا ہے۔ اور صاحبِ حرص و ہوا تاثیر سے تہی دامن ہوتا ہے۔ بالفرض

---

[۱] مکتوب ۷۰ دفترِ اوّل۔

اُس میں تاثیر ہو بھی تو وہ حرص وہواہی کی زیادتی کا باعث ہو گی .....“

دنیا طلبی جاہ وریاست کی محبت اور نفس پرستی وہ سہ گونہ امراض تھے جنھوں نے اکبرؔ دین کے فتنے کی جڑیں پھیلانے اور اسے ہوا دینے میں اہم حصہ لیا تھا۔ حضرتِ مجددؒ نے ارادت مند امراء کو ان سے بچانے کی کوشش بھی کی۔ شیخ فرید کو نصیحت فرماتے ہیں :

”دنیا بظاہر شیریں ہے اور تر و تازہ نظر آتی ہے لیکن فی الحقیقت زہرِ قاتل، متاعِ کاذب اور دامِ بلا ہے۔ اس کا منظورِ نظر ذلیل وخوار اور اس کا عاشق فاتر العقل ہوتا ہے۔ اس کی مثال سونے میں مڑھی ہوئی نجاست اور شکر ملی ہوئی زہر کی ہے۔ دانا وہی ہے جو اس کھوٹی متاع پر فریفتہ نہ ہو اور خراب اسباب کا اسیرِ دام نہ ہو۔“ ۲۲؎

انہی کو ایک اور مکتوب میں رقمطراز ہیں :

”انسان کے نفسِ امّارہ کی فطرت میں جاہ وریاست کی محبت گندھی ہوئی ہے۔ اس کا مقصود اپنے ہم سروں پر ہمہ تن تفوّق حاصل کرنا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ساری مخلوق اس کی محتاج اور اس کے اوامر ونواہی کی پابند ہو جائے اور وہ کسی کا محتاج اور محکوم نہ ہو۔ گویا وہ خدائے بے مثل کے ساجھی اور شریک ہونے کا مدعی ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ وہ اس نامسعود شرکت پر بھی راضی نہیں ہوتا اور خواہاں ہوتا ہے کہ اکیلا وہی حکمراں ہو اور ساری دنیا اس کے آگے محکوم و نگوں سار۔

حدیثِ قدسی میں ہے ـــــ ”اپنے نفس کو دشمن رکھ کیونکہ وہ میری دشمنی میں کھڑا ہے“۔ لٰہذا جاہ وریاست اور برتری اور تکبر وغیرہ جو نفس کا مقصود و مطلوب ہیں، ان کے حصول کے لیے نفس کو پالنا درحقیقت اسے اللہ تعالیٰ کی دشمنی میں مدد اور قوت دینے کے مترادف ہے۔“ ۲۳؎

۲۲؎ مکتوب ۵۰ دفتر اول ۔ ۲۳؎ مکتوب ۵۲ دفتر اول

ایرانی امراء اور علماء کے افکار و عقائد ایک اور بڑا فتنہ تھے جن کی وجہ سے مسلمان امراء کے اندر اکبر کے خلافِ شریعت اقدامات کی مزاحمت کی قوت ختم ہو کر رہ گئی تھی اور انہیں "دین جدید" کا نرم چارہ بنا دیا تھا۔ حضرت مجددؒ نے اس جانب بھی توجہ فرمائی اور اپنے مکتوبات میں امراء کو اس سے خبردار رہنے اور اہلِ سنّت کے عقائد سے واقفیت بہم پہنچانے اور انہیں حرزِ جاں بنانے کی تلقین کی۔ شیخ فرید کو لکھتے ہیں :

"یہ فقیر آپ کی صحبت سے دور ہے۔ خبر نہیں کہ آپ کی مجلسوں میں کس قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور آپ کی خلوت و جلوت کا ساتھی کون ہے ؎

خواہم بستد از دیدہ دریں فکرِ جگر سوز
کا خوش شد کہ شد منزل و آسائش جوابت

یہ بات یقینی طور پر جان لیں کہ بدعتی کی صحبت کافر کی صحبت سے زیادہ فساد انگیز ہوتی ہے۔ اور تمام بدعتی فرقوں میں بدتر وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے ساتھ بغض رکھتے ہیں۔ قرآن اور شریعت کی تبلیغ اصحابؓ ہی نے کی ہے۔ ان پر طعن سے قرآن اور شریعت پر طعن آتا ہے۔ قرآن کریم حضرت عثمانؓ نے جمع کیا ہے۔ اگر حضرت عثمانؓ مطعون ہیں تو قرآن مجید بھی مطعون ہے۔ اصحابِ کرامؓ کے مابین جو جھگڑے اور نزاع ہوئے ان میں نفسانی خواہشات کا دخل نہیں تھا اس لیے کہ خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں ان کے نفوس کا تزکیہ ہو چکا تھا اور وہ نفسِ امارہ سے آزاد ہو چکے تھے......

آپ کو چاہیئے کہ قطبِ زماں مخدوم جہانیاں سرّہٗ کی معتبر کتابیں تھوڑی تھوڑی ہر روز آپ کی مجلس میں پڑھی جاتی رہیں۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصحاب کی مدح و توصیف کن الفاظ میں کی ہے اور کس ادب کے ساتھ انہیں یاد کیا ہے"۔[۲۴]

---

[۲۴] مکتوب ۵۴ دفتر اوّل

خواجہ جہان کے نام لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ آپ کے دل کو زندہ سلامت رکھے، آپ کو شرحِ صدر اور نفس کی پاکیزگی عطا کرے...... یہ سب کچھ بلکہ رُوح، سرّ، خفی اور اخفیٰ کے سارے کمالات حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واتباع کے ساتھ والبتہ ہیں۔ آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور خلفائے راشدین کی پیروی کو لازم پکڑنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ ہدایت کے ستارے اور ولایت کے آفتاب ہیں۔ جس شخص کو ان کے اتباع کا شرف حاصل ہوا۔ فقد فاز فوزاً عظیما (وہ عظیم فوز وفلاح سے بہرہ یاب ہوا) اور جس نے ان کی مخالفت کی فقد ضلّ ضلالاً بعیدا (وہ سخت گمراہ ہوگیا)"[۲۵]

تربیتِ فکر وشعور اور تطہیرِ نگاہ وکردار کا یہ مرحلہ خدا جانے کتنا دراز ہوتا کہ ۱۶۰۵ء میں اکبر کو موت نے آلیا اور حضرت مجددؒ کسی توقف کے بغیر دوسرے مرحلے میں گامزن ہوگئے۔ جہانگیر کی تخت نشینی میں بھی حضرت مجددؒ کے ان عقیدت مند امراء کا ہاتھ تھا۔ الحاد اور بے دینی کے علمبردار امرائے دربار جہانگیر کے بیٹے خسرو کو تخت پر بٹھانا چاہتے تھے۔ اسلام پسند امراء نے جہانگیر کی حمایت اس شرط پر کی تھی کہ وہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد اکبری دین کا قلع قمع کرے گا اور شریعتِ اسلامی کو رائج ونافذ کرے گا۔ جہانگیر نے اپنے قول وقرار کو اس طرح نبھایا کہ اکبری دین کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ اس دین کے پُرجوش عقیدت مند اور مبلّغ اکبر کی زندگی ہی میں مر چکے تھے۔ اس طرح اُس کا دین اپنی موت آپ مرگیا تاہم ملک وملت کی اجتماعی زندگی پر اس کے جو اثرات مترتّب ہو چکے تھے وہ بدستور موجود تھے۔ مسلمان، حاکم قوم ہونے کے باوجود مظلوم ومجبور تھے اور غیر مسلموں کی زیادتیوں کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ جہانگیر کے ان ابتدائی ایام میں مسلمانوں کی حالتِ زار اور کفار کی دلیری کا ذکر حضرت مجددؒ کے

---

[۲۵] مکتوب ۲۵ دفتر اوّل

مکاتبت میں بھی ملتا ہے۔ خانِ اعظم کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

"اسلام کی غربت اور بے چارگی اس انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ کفار برملا اسلام پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں اور مسلمانوں کی مذمت کرتے ہیں۔ احکامِ کفر کو بے دھڑک جاری کرتے ہیں اور مسلمان ہیں کہ انہیں اسلامی احکام کے اجراء سے روکا جاتا ہے اور ان کی بجا آوری پر انہیں مقہور و مطعون گردانا جاتا ہے"۔۶۲

لالا بیگ کے نام رقمطراز ہیں :

"تقریباً ایک صدی سے اسلام پر غربت و بیکسی کا عالم طاری ہے ...... اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی شعارِ اسلامی کا اظہار کرتا ہے تو مار ڈالا جاتا ہے۔ گائے ذبح کرنا ہندوستان میں اسلام کا بڑا شعار ہے، کفار جزیہ دینے پر تو شاید رضامند ہو جائیں، مگر گائے ذبح کرنے پر ہرگز راضی نہ ہوں گے"۔۶۷

اس کیفیت کے انسداد کے لیے منفی اقدام کے ساتھ مثبت اقدامات کی بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس مرحلے میں حضرت مجددؒ اپنے عقیدت مند امراء کو اسی کی ترغیب و دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔ وہ انہیں تلقین کرتے ہیں کہ بادشاہ کے سامنے مسائلِ شرعیہ اور کتاب و سنت اور اجماعِ امت کے مطابق عقائدِ اسلامیہ واشگاف بیان کئے جائیں تاکہ لاعلمی دور ہو اور کوئی شخص بادشاہ کو نہ بہکا سکے۔ شیخ فرید کو لکھتے ہیں :

"آج کہ دولتِ اسلام کی ترقی میں مانع اسباب کے زوال اور بادشاہِ اسلام کی تخت نشینی کی خوش خبری خاص و عام کو پہنچی، اہلِ اسلام نے ضروری سمجھا کہ بادشاہ کے ساتھ تعاون اور ترویجِ شریعت اور تقویتِ ملت کے متعلق اس کی راہنمائی کریں خواہ یہ امداد و تقویت زبانی ہو یا عملی۔ اوّلیں امداد یہ ہے کہ مسائلِ شرعیہ اور کتاب و

---

۶۲ مکتوب ۶۵ دفترِ اوّل

۶۷ مکتوب ۸۱ دفترِ اوّل

سنت اور اجماعِ اُمت کے مطابق عقائدِ اسلامیہ کو واشگاف بیان کیا جائے تاکہ کوئی بدعتی اور گمراہ بادشاہ کو غلط راہ پر ڈال سکے اور کام کو بگاڑ نہ ڈالے .... چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بادشاہ کا قرب اور اس کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی استطاعت بخشی ہے اس لیے آپ سے توقع ہے کہ خلوت و جلوت میں شریعتِ محمدی کی ترویج کی پوری کوشش کریں گے اور مسلمانوں کو غربت و بے چارگی کے عالم سے نکالیں گے"[۸۹]

خان جہان کے نام لکھتے ہیں :

" آپ جانتے ہیں بادشاہ رُوح کی مانند ہوتا ہے اور باقی انسان جسم کی مثال۔ اگر رُوح صالح ہوتی ہے تو جسم بھی صالح اور سالم رہتا ہے اور اگر رُوح میں کوئی بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے تو سارا جسم اس بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ بادشاہ کی اصلاح کی کوشش کرنا تمام انسانوں کی اصلاح کی کوشش کرنے کے مترادف ہے اور یہ اصلاح اسلامی تعلیمات کے اظہار سے ہو سکتی ہے ۔ اس طرح کہ جب بھی موقعہ ہاتھ آئے اہلِ سنت والجماعت کے معتقدات کے موافق صحیح اسلامی تعلیمات بادشاہ کے کان میں ڈالی جائیں اور مخالفین کے مذاہب کی تردید کی جائے ۔ اگر یہ دولت حاصل ہو جاتی ہے تو گویا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی وراثتِ عظمیٰ ہاتھ آجاتی ہے اور آپ کو تو یہ دولت مفت مل رہی ہے ۔ اس کی قدر و قیمت جاننی چاہیئے"[۹۰]

پھر حضرت مجددؒ ان اصحاب کو وقت کی اہمیت اور نزاکت کا احساس دلاتے ہیں کہ کام کا وقت یہی ہے اسے ہاتھ سے کھو دیا تو منزلِ مقصود آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گی اور گمراہ درباری بادشاہ کو غلط راستے پر ڈال دیں گے اور پھر ماضی کے شب و روز پلٹ آئینگے ۔

خان اعظم کے نام رقمطراز ہیں :

---

[۸۹] مکتوب ۴۷، دفتر اول

[۹۰] مکتوب ۶۷، دفتر دوم

"جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے کام اور باتوں میں تاثیر بخشی ہے اور آپ کی دینی عظمت اپنے ہم عصروں کی نگاہ میں ظاہر ہوگئی ہے یہ کوشش فرمائیں کہ اہل کفر کے وہ بڑے بڑے رسوم و شعائر جو مسلمانوں میں رائج کر دیئے گئے ہیں مٹا دیئے جائیں اور مسلمان ان منکرات سے محفوظ ہو جائیں ...... پچھلی حکومت کو دینِ مصطفوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ عناد معلوم ہوتا تھا۔ موجودہ حکومت میں بظاہر وہ عناد نہیں ہے اور اگر ہے تو لاعلمی کی بنا پر ـــ ڈر یہ ہے ہمیں یہاں بھی عناد کارفرما نہ ہو جائے اور مسلمانوں کے لیے معاملہ اور بھی تنگ ہو جائے۔ ع

چو بید بر سرِ ایمانِ خویش می لرزم" ؎۳۰

صدر جہاں کے نام لکھتے ہیں:

"اب جب کہ سلطنت میں انقلاب آگیا ہے اور غیر مسلموں کا جذبۂ عناد ٹوٹ چکا ہے آئمۂ اسلام وزراء اور علمائے کرام پر لازم ہے کہ باہمہ قوت احکامِ شریعت کی ترویج میں لگ جائیں۔ سب سے پہلے ان ارکانِ اسلام کو قائم کریں جنہیں عہدِ ماضی میں منہدم کر دیا گیا تھا۔ تاخیر میں کچھ بھی بھلائی نہیں ہے۔ اس تاخیر و تعویق سے ہم غریبوں کے دلوں میں سخت اضطراب برپا ہے۔ زمانۂ ماضی کے شدائد و مصائب سے مسلمانوں کے دل ابھی تک متاثر ہیں۔ ایسا نہ ہو اُن کا تدارک نہ ہونے پائے اور اسلام کی غربت اور بڑھ جائے"۔ ؎۳۱

لالہ بیگ کے نام رقمطراز ہیں:

"اگر آغازِ حکومت ہی سے اسلامیت نے رواج پایا اور مسلمانوں نے اپنا وقار قائم کر لیا تو فبہا لیکن اگر معاذ اللہ کچھ بھی وقفہ پڑ گیا تو مسلمانوں کا معاملہ بہت مشکل

؎۳۰ مکتوب ۶۵ دفتر اوّل

؎۳۱ مکتوب ۱۹۵ دفتر اوّل

ہو جائے گا۔ الغیاث، ثم الغیاث، الغیاث"۔ ۳۲؎

حضرتِ مجددؒ اس کام کی انہیں بار بار تاکید کرتے ہیں اور فرماتے ہیں اگر اس تبلیغِ حق اور دعوتِ دین کی پاداش میں سختیاں اور مصائب بھی جھیلنا پڑیں تو گریز نہیں کرنا چاہیے۔ شیخ فرید کو لکھتے ہیں:

"بہر حال مسائلِ شرعیہ کی حقیقت سے بادشاہ کو مطلع کرنا ضروری ہے۔ جب تک ایسا نہ ہو گا علماء اور بادشاہ کے مقربین اس کے ذمّہ دار ہوں گے۔ ایسی گفتگوؤں کی پاداش میں اگر تکلیف بھی اٹھانی پڑے تو بڑی سعادت ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے احکامِ شرعی کی تبلیغ میں کیا کیا مصائب و شدائد نہیں جھیلے اور کیا کیا رنج اور دکھ نہیں دیکھے۔ ان کے گُل سر سبد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ـــــ ما اوذی نبی مثل ما اوذیت" "کسی نبی کو اتنی تکلیفیں نہیں دی گئیں جتنی کہ مجھ۔" ۳۳؎

اسی جدّ وجہد کا نتیجہ تھا کہ بادشاہ چار منتخب علماء کو دربار میں رکھنے پر آمادہ ہو گیا جو نفاذِ شریعت میں اس کی رہنمائی کر سکیں۔ حضرتِ مجددؒ نے اصولاً بادشاہ کے اس رجحان پر اظہارِ مسرت فرمایا۔ مگر اس تجویز میں جو خطرات پنہاں تھے اُس سے اپنے ارادت مند امرائے دربار کو متنبّہ فرمایا اور رہنمائی کی کہ چار کے بجائے ایک حق پرست عالم ہونا چاہیئے۔ اسی سلسلے میں علمائے سُو سے خبردار رہنے کی تلقین فرمائی۔

شیخ فرید کے نام رقمطراز ہیں:

"الحمد للہ علی ذالك۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر خوشخبری کا اور کیا ہو گی اور ماتم زدوں کو اس سے زیادہ مژدۂ جانفزا کون سا ہو گا ..... یہ حقیر اس سلسلے میں کچھ باتیں لکھنا ضروری سمجھتا ہے......

۳۲؎ مکتوب ۱۸ دفتر اوّل

۳۳؎ مکتوب ۱۹۲ دفتر اوّل

"غرض یہ ہے کہ ایسے دیندار علماء بہت تھوڑے ہیں جن کے دل جاہ و امارت کی محبت سے خالی ہوں اور جو ترویجِ شریعت اور حمایتِ ملّت کے سوا اور کوئی غرض نہ رکھتے ہوں ان علماء میں اگر حبِ جاہ و منصب پیدا ہو گئی تو وہ ایک دوسرے کے حریف بن جائیں گے۔ ہر ایک اپنی فضیلت و علمیت جتائے گا۔ پھر وہ اختلافی باتوں کو بیچ میں لے آئیں گے اور انہیں بادشاہ کا تقرّب حاصل کرنے کا ذریعہ بنائیں گے۔ لامحالہ اس کام میں سخت مشکل پیدا ہو جائے گی۔ عہدِ ماضی میں علماء کے اختلافات ہی نے دنیا کو مصیبت میں ڈالا تھا اور اب پھر وہی معاملہ درپیش ہے۔ ترویجِ شریعت تو در کنار اندیشہ ہے کہ یہ تجویز پھر تخریب دین کا سبب نہ بن جائے (اس سے نیز علمائے سُو کے فتنے سے خدا کی پناہ)۔ اگر اس مقصد کے لیے ایک عالم منتخب کیا جائے تو سعادت و خوش بختی کے کیا کہنے کہ ایسے عالم کی صحبت تو اکسیر ہے۔ لیکن اگر ایسا عالم نہ ملے تو پھر اچھی طرح سوچ بچار کر کے گروہِ علماء میں سے جس کو بہترین سمجھیں اسے اختیار کر لیں"......

علمائے دین کا کردار و علم اسلامی معاشرے جو اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

"جس طرح کہ مخلوقِ خدا کی نجات علماء کے وجود سے ہے اسی طرح دنیا کا خسران بھی ان سے وابستہ ہے۔ بہترین علماء بہترین عالم ہیں اور ان میں سے بدترین، بدترینِ خلائق ہیں۔ دنیا کی ہدایت و گمراہی انہی سے وابستہ ہے۔ ایک بزرگ نے ابلیسِ لعین کو دیکھا کہ بیکار اور مطمئن بیٹھا ہے۔ اس سے اس کا سبب پوچھا۔ بولا: اس زمانے کے علماء میرا کام انجام دے رہے ہیں اور دنیا کو بہکانے اور گمراہ کرنے کے لیے وہی کافی ہیں۔ ؎

عالم کہ کامرانی و تن پروری کند
او خویشتن گم است کرا رہبری کند

العرض اس سلسلے میں صحیح غور وفکر کے بعد اقدام کی ضرورت ہے۔ جب معاملہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو پھر اس کا کوئی مداوا ہونے نہیں پاتا۔"۲۴ے

صدر جہان کے نام لکھتے ہیں:

"سنا ہے بادشاہِ اسلام اپنے اسلامی رجحانات کی بنا پر کچھ علماءؒ چاہتے ہیں۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔ جناب کو معلوم ہے گذشتہ دور میں جو بگاڑ بھی پیدا ہُوا علمائے سُو کی بدبختی سے ہُوا۔ اس معاملے میں خوب اچھی طرح دیکھ بھال کر دیندار علماء کا انتخاب کیا جائے۔ علمائے سُو دین کے چور ہیں۔ ان کا مقصد جاہ ومال اور خلقِ خدا کی نگاہوں میں قدر ومنزلت کا حصول ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے فتنے سے پناہ میں رکھے۔ ہاں جو اچھے علماء ہیں وہ بہترین لوگ ہیں۔ انہی کی روشنائی قیامت کے روز شہدائے فی سبیل اللہ کے خون کے ساتھ تولی جائے گی اور اس روشنائی کا پلہ بھاری رہے گا۔ شر الناس شر العلماءؒ وخیر الناس خیر العلماءؒ"۲۵ے

حضرتِ مجددؒ نے صرف اپنے ارادت مند امرائے دربار ہی کو ترویجِ شریعت کی ترغیب و تحریک پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اپنے ایک مرید شیخ بدیع الدّین کو لشکرِ شاہی میں ارشاد وہدایت کے لیے بھی بھیجا (۱۶۱۹ء)۔ اس لیے کہ شخصی حکومتوں میں فوج ہی اقتدار کی ریڑھ کی ہڈی ہوا کرتی ہے۔ شیخ بدیع الدّین کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور فوجی سپاہی اور افسر بڑی تعداد میں آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے لگے۔ جس سے ملحد امرائے لشکر و دربار کو سخت تشویش لاحق ہوئی۔ فوج میں فکری واخلاقی انقلاب کے معنی ان کی عظمت و جاہ اور منصب واعزاز کی موت اور شریعتِ اسلام کی سربلندی کے تھے؛ چنانچہ انہوں نے سر توڑ مخالفت کی۔ علمائے سُو، جاہل صوفیوں اور اہلِ بدعت نے آلۂ کار کا کام دیا۔ گوناگوں اتہامات تراش کر حضرت

۲۴ے مکتوب ۵۳ دفتر اوّل

۲۵ے مکتوب ۱۹۴ دفتر اوّل

مجددؒ کے خلاف ایک عام "شورش" کھڑی کر دی اور قتل تک کا فتویٰ دے دیا گیا۔ ادھر بادشاہ کے کان جس طرح بھرے گئے اس کا اندازہ خود جہانگیر کے بیان سے ہو سکتا ہے جو توزکِ جہانگیری میں درج ہے اور جس کا خلاصہ یہ ہے :

اس زمانے میں ایک عرضداشت پہنچی کہ شیخ احمد نامی ایک شخص نے دامِ مکروفریب بچھا کر بے شمار ظاہر پرستوں کو اپنا شکار بنا لیا ہے اور ہر شہر اور علاقے میں اپنے مریدوں میں سے ایک شخص کو جو دکان آرائی، معرفت فروشی اور مردم فریبی میں دوسروں سے پختہ تر ہوتا ہے اپنا خلیفہ بنا رکھا ہے۔ اپنے مریدوں کے لیے خرافات اور لاطائل باتوں سے لبریز ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام مکتوبات ہے۔ جس میں کفر و زندقہ کی باتیں بھری ہوئی ہیں — چنانچہ بادشاہ نے انہیں دربار میں بلوا بھیجا۔ دربار میں اس مردِ حق نے بادشاہ سے جس انداز کے ساتھ ملاقات کی اور جو کچھ باتیں ہوئیں ان کی تفصیلات سے معاصرانہ تذکرے خالی ہیں، البتہ اس ملاقات کے بعد جہانگیر نے اپنے جن تاثرات کا اظہار کیا، وہ دلچسپ بھی ہیں اور ان کے بین السطور میں پوشیدہ اس مردِ حق کی بے نیازی، بے خوفی اور حق گوئی و بے باکی کا پتہ بھی دیتے ہیں۔ وہ توزکِ جہانگیری میں لکھتا ہے —— میں نے اس سے جو کچھ پوچھا معقول جواب نہ دے سکا۔ عقل و دانش سے بے بہرہ اور نہایت مغرور اور خود پسند دکھائی دیتا تھا۔ مجھے اس کی اصلاحِ احوال اسی میں نظر آئی کہ اسے چند روز کے لیے زندانِ ادب میں قید کر دیا جائے تاکہ اس کے مزاج کی شورش اور دماغ کی آشفتگی دور ہو جائے اور عوام کی شورش بھی فرو ہو جائے چنانچہ رائے سنگدلن کے حوالے کر دیا گیا کہ اُسے قلعۂ گوالیار میں قید کر دے۔

بہرحال بعد کے تذکروں میں یہ ذکر ملتا ہے کہ حضرتِ مجددؒ جب جہانگیر کے سامنے حاضر کئے گئے تو انہوں نے دربار کے آداب و دستور کے مطابق بادشاہ کو سجدہ نہ کیا اور بڑی جرأت کے ساتھ باتیں کیں اور ان کے جن اقوال کو بنیاد بنا کر علمائے سوء نے ان کے خلاف عام شورش اور بدظنی پیدا کی تھی، اُن کے بارے میں اپنا حقیقی موقف پیش کیا جس سے بادشاہ

لاجواب ہوگیا۔ وہ ان سے در گذر کرنا چاہتا تھا۔ مگر جن لوگوں نے یہ سارا کھیل کھیلا تھا انہوں نے یہ کہہ کر بھڑکا دیا کہ یہ شخص اپنے آپ کو اتنا بڑا سمجھتا ہے کہ حضرت ظل اللہ کو سجدہ کرنا بھی اسے گوارا نہیں۔ جہانگیر نے غضب ناک ہو کر انہیں قلعۂ گوالیار میں قید کرنے کا حکم دیدیا۔

حضرت مجددؒ قلعۂ گوالیار میں ایک سال تک قید رہے اور اس دوران میں سینکڑوں بندگان خدا کو راہِ حق پر لائے۔ قید کا یہ زمانہ انہوں نے نہایت صبر و عزیمت سے کاٹا۔ اس زمانے میں ان کے ذوق و شوق کا جو عالم تھا، وہ اپنی قسمت پر جس طرح صابر و شاکر تھے اور راہِ حق میں آنے والے مصائب سے جس طرح لذت گیر ہو رہے تھے اُس کا ذکر اُن کے بعض مکتوبات میں ملتا ہے جو انہوں نے قید خانے سے لکھے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے نام لکھتے ہیں :

"مصائب و شدائد میں اگرچہ تکالیف اٹھانی پڑتی ہیں تاہم اللہ تعالیٰ کی کرم فرمائیوں سے بہرہ ور ہونے کی امید ہوتی ہے۔ اس دنیا کی بہترین دولت غم و اندوہ اور اس کے دسترخوان کی بہترین خوش ذائقہ نعمت درد و الم ہے۔ ان شکر پاروں کو اللہ تعالیٰ نے تلخ دوا کے باریک خول میں لپیٹ دیا ہے اور اس طریقے سے آزمائش کا راستہ کھول دیا ہے۔ سعادت مند لوگ ان کی شیرینی پر نظر رکھتے ہیں اور ان کی تلخی سے شیرینی کی طرح شاد کام ہوتے ہیں۔" [1]

قید سے رہا ہوئے تو تین چار سال تک لشکر میں رکھے گئے۔ جہاں ارشاد و ہدایت اصلاحِ رُوح و کردار اور تزکیۂ نفس کا فیضان جاری رہا۔ اپنے صاحبزادوں کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

"لشکر میں ہمارا یہ غیر اختیاری اور بے خواہش قیام بے حد مفید ہے۔ یہاں کی ایک ساعت دوسرے مقامات کی بہت سی ساعتوں سے بہتر نظر آتی ہے۔

---

[1] مکتوب ۲۹ دفتر دوم

یہاں وہ کچھ میسّر ہے جو دوسرے مقام پر نہیں ہوتا - یہاں کے علوم و معارف اور اس مجمع کے احوال و مقامات بالکل نرالے ہیں - بادشاہ کی طرف سے جو تکلیف ہے اُسے اپنے بزرگ و برتر آقا کی کمال مہربانی اور رضامندی کا دروازہ سمجھتا ہوں اور اس قید کو اپنے لیے باعث سعادت گردانتا ہوں"[۲۸]

اس قیام کے دوران میں بادشاہ کے ساتھ صحبتیں بھی رہیں اور گفتگوئیں اور مذاکرات بھی ہوئے - صاحبزادگان کے نام ایک اور مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :

"اس جگہ کے حالات لائق حمد و سپاس ہیں - شب و روز عجیب و غریب صحبتوں میں گزر رہے ہیں - اللہ کے فضل و کرم سے دینی امور اور اسلامی اصولوں کے سلسلے میں جو مذاکرات اور گفتگوئیں ہوتی ہیں ان میں ذرہ بھر غفلت و مداہنت راہ نہیں پاتی - وہی باتیں جو خلوتوں اور خصوصی مجلسوں میں ہوتی ہیں - اللہ پاک کی توفیق سے ان محفلوں میں بیان ہو رہی ہیں - ایک مجلس کا ذکر بھی کروں تو دفتر درکار ہے - خصوصاً آج رات کہ رمضان المبارک کی پندرہویں رات تھی - بادشاہ کے سامنے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مقصدِ بعثت، عقل کی ناپختگی، ایمان بالآخرت، اس کے عذاب و ثواب، اللہ تعالیٰ کے دیدار، ختم نبوت، ہر صدی کے مجدد، خلفائے راشدین کی پیروی، تراویح کی سنتوں، تناسخ کا باطل ہونے، جن اور جنیوں کا ذکر اور ان کے عذاب و ثواب کا مسئلہ اور اسی نوعیت کے مسائل کا ذکر رہا...... الحمد للہ کہ بادشاہ دل جمعی سے سنتے رہے اور کسی قسم کا کوئی تغیر ان کی حالت میں رونما نہ ہوا"[۲۹]

ان صحبتوں اور گفتگوؤں سے بادشاہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا - کہاں تو وہ عالم تھا کہ ابتدائی عہدِ حکومت میں اس کا رویہ محض منفی نوعیت کا تھا اور مثبت اقدامات سے گریز

---

[۲۸] مکتوب ۰۷، دفتر سوم

[۲۹] مکتوب ۴۳ دفتر سوم

کیا جاتا تھا۔ جس سے حضرت مجددؒ یہ خطرہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اہلِ اسلام کی بے چارگی میں کہیں مزید اضافہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے صدر جہان کو اس طرف متوجہ بھی کیا اور لکھا:

"جب بادشاہان اسلام کے دل میں ترویج سُنّتِ مصطفیٰ کا جذبہ نہ ہو اور ان کے مقربین بھی اپنے آپ کو معذور سمجھیں اور چند روزہ زندگی کو عزیز جانیں تو اہلِ اسلام پر معاملہ اور بھی تنگ اور سخت ہو جائے گا۔"[۷۹]

اور کہاں یہ کیفیت کہ علاقہ راجوری (کشمیر) کے بعض مسلمان راجپوتوں کے متعلق جب یہ معلوم ہوا کہ اُن کے اندر ابھی تک ہندوانہ رسوم و عقائد موجود ہیں۔ جس طرح ہندو عورتیں اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ ستی ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ عورتوں کو ان کے شوہروں کی میت کے ساتھ قبر میں زندہ دفن کر دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کے ہاں لڑکی پیدا ہوتی ہے، تو اسے قتل کر ڈالتے ہیں۔ ہندوؤں سے ان کی بیٹیاں لیتے ہی نہیں دیتے بھی ہیں، تو ایک فرمان کے ذریعے اس قسم کے امور کو ممنوع قرار دیا اور اعلان کیا کہ آئندہ جو شخص ان بدعتوں کا مرتکب ہوگا اُسے سزا دی جائے گی۔ کانگڑہ فتح ہوا تو قاضی، میرِ عدل اور دیگر علمائے کرام کو قلعہ میں شعائرِ اسلام بجا لانے کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ اس کے سامنے اذان پکاری گئی، خطبہ پڑھا گیا اور گائے ذبح کی گئی۔ بعد ازاں اس کے حکم سے قلعہ میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی گئی۔ وہی "شیخ احمد" جو چند برس پہلے جہانگیر کی نظر میں معرفت فروش اور مردم فریب تھے، اب اتنے محترم و معزز ہو جاتے ہیں کہ وہ انہیں اپنے سے گھڑی بھر کو جدا نہیں کرتا اور شہزادہ خُرّم (شاہجہان) کو ان کے حلقۂ ارادت میں شامل کرتا ہے۔ خزینۃ الاصفیاء میں ہے

"بادشاہ (جہانگیر) از محبانِ شیخ شد، بحدیکہ گاہی آنجناب را از خود جدائی کرد و شہزادہ خُرّم را واصل حلقہ مریدانِ شیخ نمود چنانچہ تا عہد شاہجہان و عالمگیر بادشاہان باہمہ مجددیہ می شدند"۔[۸۰]

---

[۷۹] مکتوب ۱۹۵ دفتر اول [۸۰] خزینۃ الاصفیاء، حصہ اوّل ص ۶۱۳

اپنی سالگرہ پر ان کی خدمت میں دس دس ہزار روپیہ پیش کرتا نظر آتا ہے۔ اب اسے ہم یہ کہتے سنتے ہیں کہ میرے پاس ایک دستاویزِ نجات ہے اور وہ حضرت شیخ کا ارشادِ مبارک ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو جنت میں لے جائے گا تو ہم تیرے بغیر نہ جائیں گے۔

آخر کار حق فتحیاب ہوا اور باطل ذلیل و نگوں سار۔ تاہم ترویجِ شریعت کے سلسلے میں جو احکام و قوانین نافذ ہوئے ان پر جزوی طور پر ہی عمل ہو سکا۔ کچھ جہانگیر کی آشفتہ مزاجی اور رندمشربی، کچھ ملحد امرا کی مزاحمانہ تگ و دو اور کچھ نور جہاں اور اس کے رشتہ داروں کا حکومت پر اثر، ان سب نے مل کر مملکت میں کسی بڑے اور ہمہ پہلو انقلاب کو نہ آنے دیا۔ البتہ حضرت مجددؒ اس ساری جدوجہد کے نتیجے میں لشکر، دربار اور خود شاہی خاندان میں ایسا موثر عنصر تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے آگے چل کر مملکت کے نظام کو پوری طرح اسلامی شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ حضرت مجددؒ کے وصال کے تین سال بعد ۱۶۲۷ء میں جہانگیر کا انتقال ہوا اور اکبر کے تخت پر شاہجہان (اپنے بھائی شہریار کو جو نور جہاں کا داماد تھا شکست دے کر) بیٹھا۔ جس نے اجتماعی زندگی کے دھارے کا رخ بالکل پلٹ دیا۔

یہ تھا وہ کارنامہ جو حضرت مجددؒ نے انجام دیا۔ ان کے اس سارے کام میں بظاہر دینی رنگ ہی نظر آتا ہے۔ اسی لیے بعض تذکرہ نگاروں کو وہ سیاسی کام نظر نہیں آتا، جو حضرت مجددؒ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے اس دعوے کی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضرت مجددؒ کے ہم عصر یا ایک مدت بعد تک کے تذکرہ نگاروں نے اس سیاسی کام کا مطلقاً کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ غلط فہمی دراصل اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ ہمارے اپنے عہد میں دین اور سیاست کا جو جدید مفہوم اور ان کے مابین تفریق کا نظریہ رائج و شائع ہو چکا ہے ہم اسی نقطۂ نظر سے ماضی کے مصلحینِ اُمت اور مجددینِ اسلام کے کاموں کو جانچتے ہیں اور سیاسی کام صرف اسی کو کہتے ہیں۔ جب کوئی بزرگ ہماری آج کی اصطلاح میں سیاسی کام کرتے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ اسلام میں دین و سیاست کے درمیان کوئی تفریق نہیں ـــــ جب اسلام کے لیے دین کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، تو اس

سے ایک ایسا نظام حیات مراد ہوتا ہے جس میں مذہب اور سیاست باہم اس طرح مربوط ہیں کہ اُن کے درمیان کسی قسم کا خطِ امتیاز کھینچا نہیں جا سکتا۔ یہاں جو کام خالص مذہبی نوعیّت کے ہیں ان کا سیاست سے گہرا تعلّق ہوتا ہے اور جسے ہم سیاست کہتے ہیں وہ دین کا جزوِ لاینفک ہوتی ہے۔ اسی بنا پر ماضی کے تذکرہ نگاروں نے حضرتِ مجدّدؒ کے سیاسی کارنامے کو ایک دینی کارنامے ہی کی حیثیّت سے پیش کیا ہے۔ حضرتِ مجدّدؒ کے امرائے دربار کے نام مکتوبات، لشکر میں ارشاد و ہدایت کے لیے شیخ بدیع الزّماں کی جدّوجہد قید سے رہائی کے بعد لشکر میں خود حضرت مجدد کی تبلیغ وارشاد بادشاہ کے ساتھ مختلف موضوعات پر مذاکرات اور گفتگوئیں بظاہر ان میں سے کوئی بات بھی آج کی اصطلاح میں سیاسی نہیں ــــ، مگر ان سب کا جو مقصود تھا اور اس کے عملاً جو نتائج برپا ہوئے، وہ بجائے خود ظاہر کرتے ہیں کہ یہ ایک سیاسی کام تھا۔

سیاسی مکاتیب

مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ

تطہیرِ فکر و کردار

بنام

- ———— شیخ فرید
- ———— خواجہ جہاں
- ———— عبدالرحیم خانخاناں

شیخ فرید کے نام

(۱)

نماند بعصیاں کسے در گرو
کہ دارد چنیں سیّدِ پیشرو

(جس کا رہنما ایسا نبیؐ ہو وہ گناہوں کی پاداشش میں نہ پکڑا جائے گا)

پس ایسے پیغمبر سیّدِ البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے والے تمام اُمتوں سے بہتر ہیں۔ کنتم خیر امۃ اخرجت ان کے احوال کے مصداق ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جھٹلانے والے سب بنی آدم سے بدتر ہیں الاعراب اشد کفرا ونفاقاً سے ان کی حقیقتِ حال کی نشاندہی ہوتی ہے۔

دیکھئے کس خوش نصیب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کی اتباع سے نوازا اور حضور کی پسندیدہ شریعت کی پیروی سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین کی صداقت پر ایمان لانے کے بعد تھوڑے سے عمل کی بجا آوری بھی عملِ کثیر کے برابر ہوتی ہے۔

اصحابِ کہف کو اتنا بڑا مرتبہ صرف ایک نیکی کی بنا پر ملا تھا اور وہ اکلوتی نیکی یہ تھی کہ وہ غلبۂ اعدا کے زمانے میں دشمنانِ خدا کو چھوڑ کر اپنے ایمان کو زندہ سلامت لے کر ہجرت کر گئے تھے۔ مثلاً اگر سپاہی دشمنوں اور مخالفین کے غلبے کے وقت تھوڑا سا تگ و ترددبھی کرتے ہیں تو زمانۂ امن کے مقابلے میں اسے کئی گنا مقام اعتبار حاصل ہو جاتا ہے۔ نیز جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں تو حضورؐ کے متبعین بھی آپ کی اتباع کی بدولت محبوبیت کے مقامِ بلند پر پہنچ جاتے ہیں۔ کیونکہ محب اور عاشق

اُس شخص کو بھی اپنا محبوب سمجھتا ہے جس میں اپنے محبوب کی عادات و خصائل کی جھلک پاتا ہے۔ اسی پر مخالفین کو قیاس کرنا چاہیئے۔

اگر ہجرتِ ظاہری میسر نہ ہو، تو باطنی ہجرت پیشِ نظر رہنی چاہیئے۔ لوگوں کے درمیان رہ کر ان سے الگ رہنا چاہیئے۔ لعلّ اللہ یُحْدِثُ بَعْدَ ذالك امرا۔

(مکتوب ۴۴ دفتر اوّل)

(۲)

اللہ تعالیٰ کا وجود، اس کی توحید، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور حضورؐ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے ہیں، یہ سارے امور بدیہی ہیں اور کسی غور و فکر یا دلیل و برہان کے محتاج نہیں ہیں۔ شرط یہ ہے کہ انسان کی قوتِ ادراک مریض نہ ہو۔ یعنی اگر اس کی عقل امراضِ روحانی سے پاک ہے تو اسے کسی دلیل کی احتیاج نہیں۔ ان معاملات میں سوچ بچار کی ضرورت اس وقت تک ہے جب تک کہ انسان کا قلب مریض ہے۔ انسان قلبِ سلیم سے بہرہ ور ہو تو کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوگی۔ مثلاً جب کوئی شخص امراضِ صفراوی میں مبتلا ہے قند کی شیرینی کے لیے اسے دلیل کی حاجت ہوگی، لیکن جب وہ ان بیماریوں سے نجات پا جائے گا تو ذائقہ خود بخود اسے بتادے گا کہ قند میٹھا ہوتا ہے۔

یہ ایک ثابت شدہ امر ہے کہ استدلال کا دائرہ بہت تنگ اور اس کے ذریعے یقین کا حصول نہایت دشوار ہوتا ہے۔ یقین و ایمان سے بہرہ ور ہونے کے لیے امراضِ قلبی کا ازالہ ضروری ہے۔ صفرا کا مریض قند و نبات کی شیرینی سے لذت یاب ہونے کا خواہشمند ہے، تو قند کی شیرینی پر دلائل طلب کرنے کے بجائے اپنے مرض کا ازالہ کرے۔ جب صفرا جاتا رہے گا قند کی شیرینی کا یقین از خود حاصل ہو جائے گا۔ قند کی قاشِ زبان

پر رکھتے ہی وہ پکار اٹھے گا کہ قند شیریں ہوتا ہے۔ جب تک وہ خود مریض ہے اسے کوئی دلیل اور حجت یقین و اذعان کی لذت سے بہرہ اندوز نہیں کر سکتی۔ وہ تو یہی کہے گا کہ لوگو، میں تمہاری بات کیسے مان لوں، میرا ذائقہ تو کہتا ہے کہ قند کڑوا ہوتا ہے۔

اسی پر اس مسئلے کو قیاس کر لیجئے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نفس اَمّارہ بذاتِ خود احکامِ شرعی کا منکر ہے۔ اس کی ذات کا تقاضا یہی ہے کہ اسے احکامِ شرعی میں خرابی نظر آئے۔ اس کے لیے ان احکام کی خوبیوں کا اعتراف ناممکن ہے۔ بنا بریں نفسِ اَمّارہ کا تزکیہ نہایت ضروری ہے۔ اسے ذاتی برائیوں اور خرابیوں سے پاک کئے بغیر انسان ایمان و یقین سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (جس کسی نے اپنا تزکیہ نفس کر لیا وہ کامیابی سے ہمکنار ہو گا اور جس نے اس کو گناہوں سے دبا دیا وہ نامراد ہو گا) چنانچہ ثابت ہو گیا کہ شریعتِ محمدیہ کا منکر ایسا ہی مریض ہے جیسا کہ قند و نبات کی شیرینی کا منکر۔

سیر و سلوک، تزکیۂ نفس اور صفائی قلب سے آفاتِ باطنی اور امراضِ قلبی کا ازالہ مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان ایمان کی حقیقت سے آشنا ہو سکتا ہے۔ آیۂ کریمہ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (ان منافقین کے دلوں میں بیماری ہے) میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ انسان آفاتِ معنویہ (امراضِ باطنی) کا شکار ہو تو اس کا ایمان محض ظاہری اور نام و نمود کا ہوتا ہے، کیونکہ نفسِ اَمّارہ ایمان کے خلاف احکام صادر کرتا اور اپنے کفر و انکار پر قائم رہتا ہے۔ ظاہری ایمان والے کی کیفیت صفراوی مریض کی سی ہوتی ہے۔ لوگوں کے کہنے سے وہ بظاہر تسلیم تو کر لیتا ہے کہ قند شیریں ہوتا ہے، مگر اس کا ذائقہ اس کے برعکس حکم صادر کرتا ہے۔ اسے قند کی شیرینی کا یقین اسی وقت آئے گا جب صفراوی مرض سے نجات ملے گی۔ بعینہٖ انسان پر ایمان کی حقیقت اسی وقت آشکارا ہوتی ہے جب اس کا تزکیۂ نفس ہو جاتا ہے۔ تزکیۂ نفس کے بعد حاصل ہونے والا ایمان شک و ریب اور زوال سے محفوظ ہوتا ہے چنانچہ آیت

اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا يَحْزَنُوْنَ (جان لو، اللہ کے دوست نہ خوف کا شکار ہوں گے نہ غم و حزن کا) ایسے لوگوں ہی کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ اللہ ہمیں نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی طفیل ایسے ہی ایمان سے بہرہ ور فرمائے۔

(مکتوب ۴۶ دفتر اول)

(۳)

حق تعالیٰ آپ کو ظاہری دولت اور باطنی سعادت سے سعادت مند کرے۔ فی الحقیقت ظاہری دولت یہ ہے کہ اپنے ظاہر کو شریعتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگ دے اور باطنی سعادت یہ ہے کہ اپنے باطن کو ماسوا اللہ کی گرفتاری سے آزاد کیا جائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کون خوش نصیب ان دونوں عظمتوں سے مشرف ہوتا ہے۔

کار ایں است وغیر ایں ہمہ ہیچ

کام ہے تو یہی باقی سب کچھ ہیچ ہے۔

(مکتوب ۴۹ دفتر اول)

(۴)

دنیا بظاہر شیریں ہے اور تر و تازہ نظر آتی ہے، لیکن فی الحقیقت زہرِ قاتل، متاعِ کاذب اور دامِ بلا ہے۔ اس کا منظورِ نظر ذلیل و خوار اور اس کا عاشق فاترالعقل ہے۔ اس کی مثال سونے میں مڑھی ہوئی نجاست اور شکر ملی ہوئی زہر کی سی ہے۔ دانا وہی ہے جو اس کھوٹی متاع پر فریفتہ اور خراب اسباب کا اسیرِ دام نہ ہو۔

(مکتوب ۵۰ دفتر اول)

(۵)

میرے مخدوم و مکرم! انسان کے نفس امّارہ کی فطرت میں جاہ و ریاست کی محبت گندھی ہوئی ہے۔ اس کا مقصود اپنے ہمسروں پر ہمہ تن تفوق حاصل کرنا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ساری مخلوق اس کی محتاج اور اس کے اوامر و نواہی کی پابند ہو جائے اور وہ کسی کا محتاج اور محکوم نہ ہو۔ گویا وہ خدائے بے مثل کے ساجھی اور شریک ہونے کا مدعی ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ وہ اس نامسعود شرکت پر بھی راضی نہیں ہوتا اور خواہاں ہوتا ہے کہ اکیلا وہی حکمراں ہو اور ساری دنیا اس کی محکوم اور نگوں سار۔ حدیث قدسی میں ہے۔

"اپنے نفس کو دشمن رکھ کیونکہ وہ میری دشمنی میں کھڑا ہے"۔

لہٰذا جاہ و ریاست اور برتری اور تکبّر وغیرہ، جو نفس کا مقصود و مطلوب ہیں، ان کے حصول کے لیے نفس کو پالنا درحقیقت اسے اللہ تعالیٰ کی دشمنی میں مدد اور قوت دینے کے مترادف ہے۔

حدیث قدسی میں ہے الکبریاء ردائی والعظمة ازاری فمن نازعنی فی شیءٍ منہما ادخلتہ فی النار ولا ابالی۔ کبریائی میری چادر ہے اور عظمت میرا کپڑا، جس نے ان دونوں میں سے کسی کے بارے میں مجھ سے نزاع کیا میں اُسے دوزخ میں جھونک دوں گا اور مجھے کچھ پروا نہ ہوگی۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا مقصد اور شرعی تکلیفوں میں حکمت یہی ہے کہ نفس امّارہ عاجز و درماندہ ہو جائے۔ احکام شرعی نفسانی خواہشات کو کچلنے ہی کے لیے نازل ہوئے ہیں۔ احکام شریعت کے مطابق جتنا زیادہ عمل ہوگا اتنی ہی نفسانی خواہشات میں کمی آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک حکم شرعی کی بجا آوری ان ہزار سالہ ریاضتوں اور مجاہدوں سے بہتر ہے۔ جو اپنی نفسانی خواہشات کو دفع کرنے کے لیے اپنی طرف سے کی جاتی ہیں۔ بلکہ جو ریاضتیں اور مجاہدے شریعت غرّا کے مطابق نہیں ہوتے وہ نفسانی خواہشات کی مزید تقویت و نصرت کا باعث ہوتے ہیں

ہیں۔ برہمنوں اور جوگیوں نے ریاضتوں اور مجاہدوں میں کمی نہیں کی مگر بے سُود۔ ان سے نفس کی تقویت اور پرورش کے سوا انہیں کچھ حاصل نہیں ہوا۔

مثلاً بطورِ زکواۃ، جس کا شریعت نے حکم دیا ہے، اگر ایک دام خرچ کیا جاتا ہے تو یہ اپنی خواہش کی تسکین اور اپنی مرضی پر خرچ کئے جانے والے ہزار دینار سے زیادہ بہتر ہے۔ اور نفس کی ذلت خواری میں مؤثر ہے۔ اسی طرح حکم شرعی کے مطابق عید الفطر کے دن کھانا اپنی مرضی سے کئی سال روزے رکھنے سے بہتر ہے۔ نمازِ صبح کی دو رکعتیں باجماعت ادا کرنا سنت ہے اور یہ اس بات سے کہیں بہتر ہے کہ آدمی تمام رات تہجد پڑھتا رہے اور صبح کی نماز بے جماعت ادا کرے۔

الغرض جب تک ہوس سیادت کی نجاست سے پاک صاف نہیں ہو جاتا نجات محال ہے اس مرض کے ازالے کی فکر ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ موت سے ہمکنار کر دے۔

(مکتوب ۵۲ دفتر اول)

(۶)

یہ فقیر آپ کی صحبت سے دور ہے۔ خبر نہیں کہ آپ کی مجلسوں میں کس قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور آپ کی خلوت و جلوت کا ساتھی کون ہے۔ ؎

خوابم بشد از دیدہ دریں فکر جگر سوز
کاغوشِ شد کہ شد منزل و آسائش جوابت

یہ بات یقینی طور پر جان لیں کہ بدعتی کی صحبت کافر کی صحبت سے زیادہ فساد انگیز ہوتی ہے اور تمام بدعتی فرقوں میں بدتر وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے ساتھ بغض رکھتے ہیں۔ قرآن و حدیث کی تبلیغ اصحاب ہی نے کی ہے ان پر طعن سے قرآن اور شریعت پر طعن آتا ہے۔ قرآن کریم حضرت عثمانؓ نے جمع کیا ہے اگر حضرت عثمانؓ مطعون ہیں تو قرآن مجید بھی مطعون ہے۔ اصحاب کرامؓ کے

مابین جو جھگڑے اور نزاع ہوئے، ان میں نفسانی خواہشات کو دخل نہیں تھا اس لیے کہ خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں ان کے نفوس کا تزکیہ ہو چکا تھا اور وہ نفس امارہ سے آزاد ہو چکے تھے۔ اتنا جانتا ہوں کہ حضرت امیرؓ اس بارے میں حق پر تھے اور ان کے مخالف خطا پر۔ لیکن یہ خطا اجتہادی تھی جس کی انتہا فسق پر نہیں ہوتی۔ بلکہ اجتہادی خطا کے باب میں مجال ملامت بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایسی خطا کرنے والے کو بھی ایک درجہ ثواب ملتا ہے اور کم بخت یزید اصحاب سے نہیں ہے۔ اس کی بدبختی میں کسے کلام ہو سکتا ہے، جو کام اس نے کیا کوئی کافر فرنگی بھی نہیں کرتا۔

آپ کو چاہیئے کہ قطب زمان مخدوم جہانیاں قدس سرہٗ کی معتبر کتابیں تھوڑی تھوڑی ہر روز آپ کی مجلس میں پڑھی جاتی رہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصحاب کی مدح و توصیف کن الفاظ میں کی ہے اور کس ادب کے ساتھ انہیں یاد کیا ہے۔

(مکتوب ۵۴ دفتر اول)

(۷)

انبیائے کرام کا وجود بنی آدم کے لیے سراسر رحمت ہے۔ دنیا والے انہی کے وسیلے سے نجات ابدی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ اگر انبیاءؑ نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ جو غنیِ مطلق ہے، نہ تو دنیا کو اپنی ذات و صفات کی خبر دیتا اور نہ کوئی انسان اپنی استعداد اور لیاقت سے اسے پہچان سکتا۔ پھر نہ تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ذمہ دار گردانتا اور نہ بندے اس کی رضا سے واقف ہو پاتے۔

اللہ کے یہ برگزیدہ بندے، سب کے سب دین کے بنیادی اصولوں پر متفق ہیں۔ ان سب کا حکم ایک ہی ہے۔ ان سب نے باری تعالیٰ کی ذات و صفات، حشر و نشر، بعثت

انبیاء و رسول، نزول ملائکہ، وحی، انعامات جنت اور عذاب دوزخ کے متعلق یکساں نوعیت کی تعلیم دی ہے۔ اختلاف اگر ہے تو بعض احکامات میں ہے، جو دین کی فروعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی پر اس عہد کے لوگوں کے احوال و ظروف کے مطابق وحی نازل کی اور مخصوص احکام دیئے۔ احکام میں تغیر اور تبدیلی اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی رہی ہے۔

انبیائے کرام کی ایک متفقہ تعلیم یہ رہی ہے کہ نہ تو غیر اللہ کی عبادت کی جائے، نہ اللہ کی الوہیت میں کسی کو ساجھی بنایا جائے اور نہ کسی ہستی کو رب اور پروردگار گردانا جائے غیر اللہ کی عبادت کی نفی کا حکم انبیاء کے ساتھ ہی مخصوص رہا ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جس سے انبیاء کرام کے پیروکاروں کے سوا اور کوئی شخص بہرہ مند نہیں ہوا۔ صرف انبیاء نے یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور اس کی ذات و صفات میں کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ۔

منکرین نبوت گو خدا کو ایک مانتے ہیں مگر ایسا یا تو مسلمانوں کی تقلید میں کہتے ہیں یا وہ اللہ تعالیٰ کو محض واجب الوجود ہونے کے اعتبار سے ایک کہتے ہیں۔ رہا استحقاق عبادت تو ان کے نزدیک یہ حق اللہ کے علاوہ دوسروں کو بھی حاصل ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ اور نقطۂ فکر اس معاملے میں مختلف ہے۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ اپنے وجود ہی کے اعتبار سے واحد و لاشریک نہیں ہے۔ کلمہ طیبہ "لا الٰہ الا اللہ" باطل خداؤں کی عبادت کی نفی بھی کرتا ہے اور اللہ کے معبود برحق ہونے کا اثبات بھی۔

دوسری بات جو حضرات انبیاء کا خاصا رہی ہے یہ ہے کہ ان سب حضرات نے اپنے کو بشر کہا ہے۔ ان کی تعلیم ہمیشہ یہی رہی ہے کہ ہم تم ہی لوگوں کی طرح انسان ہیں، معبود حقیقی صرف اللہ ہے۔ انھوں نے انسانوں کو اللہ کی عبادت ہی کی دعوت دی ہے۔ انبیاء سے مخصوص ایک اور بات یہ ہے کہ یہ حضرات سب کے سب اللہ کو حلول و اتحاد سے منزہ

اور پاک قرار دیتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نہ کسی انسان میں داخل ہو سکتا ہے نہ کسی انسان سے متحد ہو سکتا ہے۔ لیکن منکرینِ نبوت یہ عقیدہ نہیں رکھتے بلکہ ان کے پیشوا تو خود الوہیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اندر حلول کر گیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو عبادت کا مستحق گردانتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ وہ عبودیت و بندگی کے دائرے سے نکل کر خلافِ شریعت امور کا ارتکاب کرتے ہیں اور لوگ ہیں کہ اُن کے ہر قول و عمل کو صواب سمجھتے ہیں۔

تیسری بات جس پر حضرات انبیاء ہمیشہ متفق رہے ہیں، یہ ہے کہ یہ حضرات نزولِ ملائکہ کے قائل ہیں اور انہیں حاملِ وحی یقین کرتے ہیں، چنانچہ یہ حضرات جو کچھ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہتے ہیں۔ اگر اجتہادی احکام میں ان سے کوئی بھول چوک ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے ان کی اصلاح فرما دیتا ہے۔ اس کے برعکس منکرینِ نبوت جو کچھ بھی کہتے ہیں من گھڑت کہتے ہیں اور اسے صحیح گردانتے ہیں۔ اب آپ خود ہی انصاف سے کام لیں کہ ایسے شخص کی تعلیمات پر کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے جو اپنی نادانی کی بنا پر اپنے آپ کو مستحقِ عبادت سمجھتا ہے۔ میں نے یہ باتیں درست عقائد کی مزید وضاحت کی خاطر بیان کی ہیں، ورنہ حق و باطل اور نور و ظلمت میں بیّن فرق ہے۔

(مکتوب ۲۳ دفتر اول)

(۸)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول کی اطاعت کو عین اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ یعنی جو شخص رسول کے احکام و فرامین کے آگے سرِ اطاعت خم نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار بھی نہیں ہو سکتا۔ قَدْ کا کلمہ اسی

حقیقت کو مؤکد کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے، تاکہ کوئی بے شعور ان دونوں اطاعتوں کے درمیان فرق و امتیاز کرنے نہ پائے۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض رسولوں پر تو ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ ایمان و کفر کے بین بین چلنا چاہتے ہیں، بلاشبہ یہی لوگ کافر ہیں۔

(مکتوب ۱۵۲ دفتر اوّل)

(۹)

اللہ تعالیٰ کا ہم پر یہ بہت بڑا کرم ہے کہ اُس نے ہمیں دینِ حق کی راہ دکھائی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت میں پیدا کیا۔ دونوں جہان کی سعادت اور فلاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی پر منحصر ہے اور حضور کی پیروی احکامِ شرعی کی ترویج و بجا آوری اور شعائرِ کفر کے انسداد پر موقوف ہے۔ سبب ظاہر ہے۔ اسلام اور کفر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک کا نفاذ و قیام دوسرے کا زوال و انہدام ہے اور ان ضدّین کا جمع ہونا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ کافروں اور منافقوں سے جہاد کریں اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آئیں۔ یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ۔ اس سلسلے میں غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کے متعلق ارشاد فرمایا ہے۔ وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (اور بے شک آپ صاحبِ خلقِ عظیم ہیں) پتہ چلا کہ کفار پر سختی خلقِ عظیم میں داخل ہے۔ لہٰذا اسلام کی عزت کفر اور اہلِ کفر کی ذلّت و خواری میں ہے۔ جس نے اہلِ کفر کو عزیز گردانا اس نے اہلِ اسلام کو ذلّت

سے ہمکنار کیا۔ ہاں اہلِ کفر کے ساتھ کوئی دنیوی مفاد وابستہ ہو تو ناگزیر حد تک ان سے تعلقات رکھ سکتے ہیں مگر اسلام کا درجۂ کمال یہ ہے کہ دنیوی مفادات بھی خاطر میں نہ لائے جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ کفر کو اپنا اور اپنے رسول کا دشمن قرار دیا ہے بنابریں اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے میل جول اور محبت و مؤدت گناہ کبیرہ ہے۔ ان سے تعلقات و مراسم روا رکھنے کا کم سے کم نقصان یہ ہوتا ہے کہ احکام شریعت کے اجراء و نفاذ اور رسومِ کفر کے قلع قمع کرنے کی قوت گھٹ جاتی ہے۔ دوستانہ تعلقات اس مقصد کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔ یہ کم سے کم نقصان بھی درحقیقت بہت بڑا نقصان ہے۔ اللہ کے دشمنوں کے ساتھ دوستی انسان کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ دشمنی کا خوگر بنا دیتی ہے۔ انسان اپنی سادگی کی بنا پر اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہے، اور اسے خبر تک نہیں ہوتی کہ ایسے اعمال ایمان سے محروم کر دیتے ہیں۔

کفار کا تو کام ہی یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کا تمسخر اڑائیں اور ان کی توہین و تذلیل کریں۔ وہ ہر وقت مسلمانوں کو قتل کرنے یا انہیں کفر کی طرف پھیرنے کے لیے موقع کے منتظر رہتے ہیں۔ لہذا مسلمانوں کو بھی غیرتِ ایمانی سے کام لینا چاہیئے اور ان کی تذلیل و رسوائی کی فکر کرتے رہنا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں قرآن حکیم میں نجس یعنی ناپاک قرار دیا ہے۔ مسلمانوں کو بھی چاہیئے کہ وہ انہیں نجس سمجھیں اور ان کی صحبت و رفاقت سے احتراز کریں۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ انسان جب تک دیوانہ نہ بن جائے مسلمانی کے مقام بلند تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس دیوانگی سے مراد یہ ہے کہ کلمۂ اسلام کو سربلند کرنے میں انسان اپنے نفع یا نقصان کی کوئی پروا نہ کرے کیونکہ مسلمانی تو اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضا کے حصول ہی کا نام ہے، اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضا وہ نعمت ہے جس کا مقابلہ کوئی اور نعمت

نہیں کر سکتی۔

جس طرح اسلام کفر کی ضد ہے اسی طرح آخرت دنیا کی ضد ہے۔ بنابریں دنیا اور آخرت (کی محبت) کا ایک دل میں جمع ہونا ناممکن ہے۔ ترکِ دنیا کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ناگزیر ضروری امور کے علاوہ باقی تمام جائز حلال چیزوں کو تج دیا جائے۔ یہ ترکِ دنیا کی بلند تر صورت ہے۔ دوسری یہ کہ حرام اور مشتبہ امور سے اجتناب کیا جائے اور مباح امور سے بہرہ اندوز ہوا جائے۔ آج کل یہ صورت بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے لیکن عقلِ سلیم اس بات کو کبھی جائز قرار نہیں دے سکتی کہ انسان دنیا کی ناپائیدار اور فانی لذتوں کی خاطر اپنے خالق و آقا کو ناراض کرے۔ حلال و حرام کے سلسلے میں ہمیشہ علماء سے رجوع کرنا چاہیئے، کیونکہ راہِ نجات صرف ایک ہے اور وہ ہے اتباعِ شریعت اور شریعت کے صحیح علم کے امین متدین علما ہیں۔

(مکتوب ۱۶۳ دفتر اول)

(۱۰)

اللہ تعالیٰ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراثِ معنوی کے شرف سے بھی نوازے جس طرح اس نے آپ کو میراثِ ظاہری کے اعزاز سے بہرہ مند فرمایا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی میراثِ ظاہری کا تعلق عالمِ خلق سے ہے اور میراثِ معنوی کا عالمِ امر سے۔ عالمِ امر ایمان اور ہدایت و معرفت سے عبارت ہے۔ میراثِ ظاہری کی نعمت کا شکر میراثِ معنوی حاصل کرنے ہی سے ہو سکتا ہے، اور میراثِ معنوی کا حصول اتباعِ رسول کے بغیر ناممکن ہے۔ لہٰذا آپ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع فرض ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کمالِ محبت کا ثمرہ کمالِ اتباع ہے۔ کما قال اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ ھَوَاہُ مُطِیْعٌ۔ عاشق جس سے محبت کرتا ہے اس کا مطیع

ہوتا ہے۔

کمالِ محبّت کی علامت یہ ہے کہ انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں اور شریعت کے مخالفوں سے عداوت رکھے۔ محبت میں نہ منافقت کی گنجائش ہوتی ہے نہ خوشامد و تملّق کی۔ وہ کبھی اپنے محبوب کے دشمنوں سے دوستی اور مصالحت کا روادار نہیں ہو سکتا۔

متاعِ دنیا تو فریبِ محض ہے۔ آخرت کے معاملے کا انحصار اسی پر ہے۔ نجات کی امید اسی شخص کو ہو سکتی ہے جو دنیا کی چند روزہ زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتّباع میں بسر کرے گا۔ ورنہ وہ جو نیک عمل بھی کرے گا بیکار اور بے فائدہ ہوگا۔ اتّباعِ رسول کی دولت سے بہرہ ور ہونے کے لیے دنیا کو یکسر ترک کر دینا ضروری نہیں ہے۔ اگر مال پر زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو اس سے بھی ترکِ کل کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ زکوٰۃ دے دینے سے مال نقصان سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ بنابریں ضرر اور نقصان کا علاج یہ ہے کہ زکوٰۃ دی جائے۔ لہٰذا آپ کو احکامِ شرعی کی ادائیگی کی فکر کرنی چاہیئے۔

شریعت کی ترویج اور اہلِ بدعت کی تخریب و تردید بہر حالت ضروری ہے مَنْ وَقَّرَ بِدْعَةً فَقَدْ اَعَانَ عَلٰی هَدْمِ الاسلام جس نے کسی بدعتی کی تعظیم و توقیر کی اس نے اسلام کے انہدام میں اعانت کی اس لیے آپ کو چاہیئے کہ اہلِ کفر و باطل سے عداوت رکھیں اور ان کی ذلّت و رسوائی کا سامان کریں۔ یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں یہی وہ راستہ ہے جو آپ کے جَدِّ امجد صلّی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچا سکتا ہے۔ جو شخص اس راہ کو اختیار نہیں کرے گا، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی نہیں پا سکتا۔

كَيْفَ الوُصُولُ اِلٰی سُعَادٍ وَدُوْنَهَا
قُلَلُ الجِبَالِ وَدُونَهُنَّ حُيُوفٌ

سعاد تک رسائی کیسے ہو جب کہ اس کے آگے پہاڑوں کی بلند و بالا چوٹیاں ہیں

اور ان کے پیچھے خطرات ہیں۔

(مکتوب ۱۶۴ دفتر اوّل)

خواجہ جہان کے نام

(۱)

اللہ تعالیٰ آپ کے دل کو زندہ سلامت رکھے، آپ کو شرحِ صدر اور نفس کی پاکیزگی عطا کرے ...... یہ سب کچھ بلکہ رُوح، سِر، خفی اور اخفٰی کے سارے کمالات حضرت سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واتباع کے ساتھ وابستہ ہیں۔ آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور خلفائے راشدین کی پیروی کو لازم پکڑنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ ہدایت کے ستارے اور ولایت کے آفتاب ہیں۔ جس شخص کو ان کے اتباع کا شرف حاصل ہُوا فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا (وہ عظیم فوز وفلاح سے بہرہ یاب ہوا) اور جس نے ان کی مخالفت کی فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِیْدًا وہ سخت گمراہ ہوگیا

والسلام علیکم وعلیٰ سائر من اتبع الھدیٰ

(مکتوب ۲۵ دفتر اوّل)

(۲)

دنیوی معاملات میں شریعتِ روشن کی پیروی کرنی چاہیئے۔ کھانے پینے اور رہنے سہنے میں شرعی حدود کو مدنظر رکھنا چاہیئے اور ان حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے۔ مال و دولت اور چوپایوں کی زکواۃ ادا کرنی چاہیئے جو اللہ نے فرض کردی ہے اور جب زندگی احکام شرعی سے آراستہ وپیراستہ ہوگی تو دنیا کی تکالیف سے نجات مل جائے گی اور دنیا و آخرت ایک ساتھ مل جائیں گے۔ لیکن اگر کسی کو اس قسم کا ترکِ حکمی بھی میسر نہ ہو تو وہ خارج از بحث ہے۔ وہ منافق کے حکم میں آتا ہے۔ کیونکہ محض ظاہری ایمان آخرت میں کام نہ

آئے گا۔ اس سے صرف دنیا میں مال وجان کا تحفظ مل سکتا ہے ؎

من آنچہ شرطِ بلاغ است با تو میگویم

تو خواہ از سخنم پند گیر و خواہ ملال

(میں نے کہنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ چاہے تو اس سے نصیحت حاصل کرے یا ملالِ قلب)

دیکھئے کون خوش نصیب ہے جو دنیوی جاہ وحشم، سپاہ و خدام اور لذیذ و عمدہ کھانوں اور نفیس و بیش بہا ملبوسات کے باوجود سچی باتوں پر کان دھرتا ہے اور مانتا ہے۔

؎ گوشت از بارِ دُر گراں شدہ است

نشنود نالہ و فغانِ مرا

(تیرے کان بارِ دُر سے بھاری ہیں اس لیے میرا نالہ و فغاں نہیں سن سکتے)

(مکتوب ۲۰، دفتر اوّل)

عبدالرحیم خانخاناں کے نام

(۱)

نیک بخت صادق بھائی نے آپ کا مکتوب پہنچایا اور آنجناب کے احوال زبانی بھی بیان کئے۔ بے اختیار یہ شعر زبان پر آگیا ؎

اَهْلاً لِسُعْدیٰ وَالرَّسُولِ وَحَبَّذَا
وَجْهُ الرَّسُولِ لِحُبِّ وَجْهِ الْمُرْسِلِ

؎ مرحبا اے یارِ ما و قاصدِ دلدارِ ما
دیدنِ رویت لقائے دلبرِ غمخوارِ ما

اے بھائی! جان لیجئے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ افسوس ہے اس شخص پر جس نے اس کھیتی میں کچھ نہ بویا، اپنی فطری صلاحیتوں کی زمین کو بے کار رہنے دیا اور اپنے اعمال کے بیج ضائع اور برباد کر دیئے۔

اور زمین دو طریقے سے ضائع اور بیکار ہو جاتی ہے۔ اوّل یہ کہ اس میں کاشت ہی نہ کی جائے۔ دوسرا یہ کہ اس میں ناپاک اور خراب بیج ڈالا جائے اور ضیاع اور بربادی میں یہ دوسری قسم پہلی قسم سے زیادہ مضر اور فساد انگیز ہوتی ہے۔ بیج کے ناپاک اور خراب ہونے سے مراد یہ ہے کہ ناقص سالک سے طریقہ اخذ کیا جائے اور اس کی راہ پر گامزن ہوا جائے۔ کیونکہ ناقص سالک حرص و ہوا کا متبع ہوتا ہے اور صاحبِ حرص و ہوا تاثیر سے تہی دامن ہوتا ہے۔ بالفرض اس میں تاثیر ہو بھی تو وہ حرص و ہوا ہی کی زیادتی کا باعث ہو گی۔

پس شیخِ کامل کی صحبت کیمیا ہوتی ہے۔ اس کی نظر دوا اور اس کی بات شفا ہوتی ہے .... اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو شریعتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ پر ثابت قدم رکھے۔ حقیقی مقصود یہی ہے اور اسی پر سعادت و نجات کا انحصار ہے ؎

محمدِ عربی کا بروئے ہر دو سرا ست
کسے کہ خاکِ درش نیست خاک بر سرِ او

(مکتوب ۲۴ دفتر اوّل)

(۴)

ہمیں اپنی چند روزہ زندگی صاحبِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں گذارنی چاہیئے۔ عذابِ آخرت سے بچنے اور ابدی نعمتوں سے ہمکنار ہونے کا انحصار اسی اتباع اور اطاعت پر ہے۔ پس مال و دولت اور مویشیوں کی زکواۃ پوری پوری ادا کرنی چاہیئے اور بجز اطاعتِ رب اور کوئی مقصد نہ ہونا چاہیئے۔ اسی طرح لذیذ کھانوں اور نفیس ملبوسات میں نفس کا فائدہ مدِ نظر نہ ہونا چاہیئے۔ کھانے پینے کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ادائے اطاعت کے لیے قوّت حاصل ہو۔ نفیس کپڑے پہننے سے خذوا زینتکم عند کل مسجدٍ کے سوا اور کوئی مقصد نہ ہونا چاہیئے اور اگر حقیقی نیّت حاصل نہ ہو تو بہ تکلّف پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے فَاِنْ لَّمْ تَبْکُوْا فتباکَوْا (اگر تمہیں رونا نہ آئے تو رونے والوں کی صورت بنالو) اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا اور زاری کرنی چاہیئے کہ حقیقی نیّت میسّر ہو اور تکلّف دور ہو جائے۔ ؎

مے تواند کہ دہد اشک حُسنِ قبول
آنکہ دُر ساختہ است قطرۂ بارانی ما

(عجب نہیں کہ وہ (ذاتِ پاک) میرے آنسو کو حُسنِ قبولیت عطا کر دے جس نے قطرۂ باراں

کو موتی بنا ڈالا)

علیٰ ہذا القیاس ہر معاملے میں ان علمائے حق کے فتوے کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے جنہوں نے رخصت سے گزر کر راہِ عزیمت اختیار کی ہے اور اسی (عزیمت) کو وسیلۂ نجات بنانا چاہیے۔ مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ اگر تم شکر کرو اور ایمان لے آؤ تو اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا۔

(مکتوب ۷۰ دفتر اوّل)

ترغیب و تحریک

بنام

- ـــــــــــــ خانِ اعظم
- ـــــــــــــ لالہ بیگ
- ـــــــــــــ صدرِ جہان
- ـــــــــــــ شیخ فرید
- ـــــــــــــ خانِ جہان

خانِ اعظم کے نام

اللہ تعالیٰ آپ کو احکامِ اسلامی کو سربلند کرنے کی جدّوجُہد میں دشمنانِ اسلام پر نصرت عطا فرمائے۔ مخبرِ صادق صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے۔ الاسلامُ بَدَءَ غریبًا سَیَعُوْدُ کَمَا بَدَءَ فطوبیٰ لِلغُرَبَاءِ اسلام کا آغاز مسافرانہ بیکسی کے عالم میں ہوا اور پھر بھی مسافرانہ بیکسی اس پہ طاری ہو جائے گی، سو مسافرت کے بیکسوں کو مژدۂ جانفزا ہو۔ اسلام کی غربت اور بے چارگی اس انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ کفّار برملا اسلام پر زبانِ طعن دراز کرتے اور مسلمانوں کی مذمّت کرتے ہیں۔ احکامِ کفر کو بے دھڑک جاری کرتے ہیں اور مسلمان ہیں کہ انہیں اسلامی احکام جاری کرنے سے روکا جاتا ہے اور ان کی بجا آوری پر انہیں مقہور و مطعون گردانا جاتا ہے ؎

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمۂ ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

سبحان اللہ وبحمدہٖ۔ دانشمندوں کا قول ہے الشرعُ تحتَ السَّیفِ۔ شریعت تلوار کے نیچے ہے۔ یعنی شریعت کا اجراء اور اس کی رونق بادشاہوں سے وابستہ ہے لیکن افسوس صد افسوس اب معاملہ بالکل الٹ ہوگیا ہے۔ آج جبکہ ہم کمزور ہیں اور اس معرکے میں شکست کھا چکے ہیں آپ کے وجود کو غنیمت شمار کرتے ہیں اور بجز آپ کے کوئی مردِ میداں ہمیں نظر نہیں آتا۔ حق تعالیٰ اپنے نبیؐ اور ان کے اہلِ بیت (ان پر درود و سلام اور تحیّات و برکات ہوں) کے طفیل آپ کا حامی اور ناصر ہو۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے۔ لن یومن احدکم حتی یقال انہ مجنون۔ تم میں سے کوئی شخص مومنِ کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کو دیوانہ نہ کہا جائے اس وقت وہ دیوانگی جو

اسلامی غیرت وحمیت پر مبنی ہوتی ہے اُس سے آپ ہی کی فطرت بہرہ ور دکھائی دیتی ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

آج وہ وقت ہے کہ تھوڑے سے عمل کو بھی اللہ تعالیٰ بکمالِ مہربانی شرفِ قبولیت سے نوازتے ہیں اور اس کا بہت بڑا اجر عطا فرماتے ہیں۔ اصحاب کہف سے ہجرت کے سوا اور کوئی عمل ظاہر نہیں ہوا، لیکن ان کے اسی عمل سے مقام اعتبار حاصل ہوگیا۔ غلبۂ اعدا کے زمانے میں اگر سپاہی تھوڑا سا فکر و تردد اور سعی و کوشش کرتے ہیں تو زمانۂ امن و سکون کے مقابلے میں ان کا زیادہ لحاظ کیا جاتا ہے۔ یہ جہادِ باللسان جو آج آپ کو میسّر ہے جہادِ اکبر ہے۔ اسے غنیمت جانئے اور ھل من مزید کا آوازہ پکاریئے اور اس جہاد باللسان کو جہادِ بالسیف سے افضل سمجھئے۔ ہم جیسے بے دست و پا فقیر تو اس دولت سے بھی محروم ہیں۔ ؎

دادیم ترا از گنج مقصود نشاں
گر ما نرسیدیم تو شاید برسی

ہم نے تمہیں مطلوبہ خزانے کا پتہ دے دیا ہے اگر ہم اس تک پہنچنے سے عاجز ہیں تو شاید تمہاری رسائی ہی اس تک ہو جائے۔

حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ اگر میں سجادۂ مشیخت بچھالوں تو دنیا میں کسی شیخ کو مرید نہ ملے۔ مگر مجھے دوسرا کام سونپا گیا ہے اور وہ ترویجِ شریعت اور تقویتِ ملّت کا کام ہے۔ چنانچہ آپ بادشاہوں کی صحبت میں جاتے تھے اور اپنے تصرّف سے انہیں مطیع بناتے تھے اور ان کے ذریعے سے شریعت کو رائج کرتے تھے۔

آپ سے التماس ہے کہ اس بزرگ خانوادے کے اکابر کے ساتھ آپ کو جو محبّت ہے اس کی برکت سے جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے کام اور باتوں میں تاثیر بخشی ہے اور آپ کی دینی عظمت اپنے ہم عصروں کی نگاہ میں ظاہر ہو گئی ہے، یہ کوشش فرمائیں کہ اہلِ کفر کے وہ بڑے شعائر و رسوم جو مسلمانوں میں رائج کر دیئے گئے ہیں مٹا دیئے جائیں۔

اور مسلمان ان منکرات سے محفوظ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری اور سارے مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر عطا کرے۔ پچھلی حکومت کو دینِ مصطفوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ عناد معلوم ہوتا تھا۔ موجودہ حکومت میں بظاہر وہ عناد نہیں ہے اور اگر ہے تو لاعلمی کی بنا پر ہے۔ ڈر یہ ہے کہ کہیں یہاں بھی عناد کارفرما ہو جائے اور مسلمانوں کے لیے معاملہ اور بھی تنگ ہو جائے۔

ع چو بید بر سرِ ایمانِ خویش مے لرزم

(میں اپنے ایمان کے لیے بید کی طرح لرزتا ہوں)

حق تعالیٰ ہمیں اور آپ کو سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع پر ثابت قدم رکھے

والسّلام علیکم و علیٰ جمیع من اتّبع الھدیٰ ....

(مکتوب ۶۵ دفتر اوّل)

لالہ بیگ کے نام

اللہ تعالیٰ ہمارے اور آپ کے دلوں میں حمیتِ اسلامی کا اضافہ کرے۔ تقریباً ایک صدی سے اسلام پر غربت و بیکسی کا عالم طاری ہے کہ کفار بلادِ اسلامی میں شعائرِ کفر کی ترویج ہی پر راضی نہیں ہوتے بلکہ احکامِ اسلامی کو مٹانا اور اسلام اور اہلِ اسلام کو بے اثر بنا دینا چاہتے ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی شعائرِ اسلامی کا اظہار کرتا ہے تو مار ڈالا جاتا ہے۔ گائے ذبح کرنا ہندوستان میں اسلام کا بڑا شعار ہے، کفار جزیہ دینے پر تو شاید رضامند ہو جائیں مگر گائے ذبح کرنے پر ہرگز راضی نہ ہوں گے۔

اگر آغازِ حکومت ہی سے اسلامیت نے رواج پالیا اور مسلمانوں نے اپنا وقار قائم کر لیا تو فبہا، لیکن اگر معاذ اللہ کچھ بھی وقفہ پڑ گیا تو مسلمانوں کا معاملہ بہت مشکل ہو جائے گا۔ الغیاث! الغیاث، ثم الغیاث، الغیاث۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سعادت سے کون صاحبِ نصیب بہرہ یاب ہوتا ہے اور کون شاہباز اس متاعِ بے بہا کو اچک لے جاتا ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ یہ تو اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے اسے نوازتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی پر ثابت قدم رکھے۔ والسّلام

(مکتوب ۸۱ دفترِ اوّل)

صدر جہاں کے نام

(۱)

اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت اور زندہ رکھیں۔ بادشاہوں کے احسانات سے چونکہ تمام خلقت بہرہ مند ہوتی ہے اس لیے جُبِلَتِ الخلائقُ علیٰ حُبِّ مَنْ اَحْسَنَ اِلَیْہِمْ (مخلوقات کی جبلت میں اپنے محسن کی محبت بِھا دی گئی ہے) کے مصداق لوگوں کے دل اپنے محسنوں کی طرف مائل ہوتے ہیں؛ چنانچہ بادشاہوں کے احسانِ عام سے لوگ جس قدر فیضیاب ہوتے ہیں، اس ارتباط اور تعلق کی بنا پر وہ بادشاہوں سے اتنا ہی قریب ہوتے ہیں اور ان کے برے بھلے اخلاق اور عادات سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے۔ النّاسُ علیٰ دینِ ملوکھم۔ لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہُوا کرتے ہیں۔ زمانۂ ماضی کے شب و روز اسی کا مصداق تھے۔

اب جبکہ سلطنت میں انقلاب آگیا ہے اور غیر مسلموں کا جذبۂ عناد ٹوٹ چکا ہے، ائمۂ اسلام، وزراء اور علمائے کرام پر لازم ہے کہ باہمہ قوت احکام شریعت کی ترویج میں لگ جائیں۔ سب سے پہلے ان ارکانِ اسلام کو قائم کریں جنھیں عہدِ ماضی میں منہدم کر دیا گیا تھا۔ تاخیر میں کچھ بھی بھلائی نہیں ہے۔ اس تاخیر و تعویق سے ہم غریبوں کے دلوں میں سخت اضطراب برپا ہے۔ زمانۂ ماضی کے شدائد و مصائب سے ابھی تک مسلمانوں کے دل متاثر ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کا تدارک نہ ہونے پائے اور اسلام کی غربت اور بڑھ جائے۔ جب بادشاہانِ اسلام کے دل میں ترویجِ سنّتِ مصطفےٰ کا جذبہ نہ ہو اور ان کے مقربین بھی اپنے آپ کو معذور سمجھیں اور چند روزہ زندگی کو عزیز جانیں تو اہلِ اسلام پر یہ معاملہ اور بھی تنگ اور سخت ہو جائے گا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ے آنچہ از من گم شدہ گر از سلیمان گم شدے
ہم سلیمان، ہم پری، ہم اہرمن بگریستے

جو دولت ہم سے گم ہو گئی ہے اگر سلیمان سے گم ہوتی تو وہ خود اور ان کے ساتھ دیو پری سب آٹھ آٹھ آنسو روتے۔

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبٌ لَوْ اَنَّھَا
صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

مجھ پر ایسے مصائب آن پڑے کہ اگر دن پر پڑتے تو وہ رات میں بدل جاتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو شریعتِ حقّہ کے راستے پر ثابت قدم رکھے۔

(مکتوب ۱۹۵ دفتر اوّل)

(۲)

اللہ سبحانہٗ آپ کو سلامت اور عافیت سے رکھے۔ احکام شرعی کے اجراء اور دینِ مصطفوی علیہا الصّلوٰۃ والسّلام کے دشمنوں کی ذلّت و خواری کی خبریں سن کر مسلمانوں کے قلب و رُوح کو فرحت و انبساط حاصل ہوا...... اللہ تعالیٰ اس کارِ عظیم کو فروغ بخشیں۔ مجھے یقین ہے اسلام کے پیشوا یعنی ساداتِ عظام اور علمائے کرام خلوت و جلوت میں دینِ متین کے فروغ اور صراطِ مستقیم کی تکمیل میں مصروف ہوں گے۔ یہ بے سروسامان فقیر کیا دم مارے۔

سنا ہے بادشاہِ اسلام اپنے اسلامی رجحانات کی بنا پر کچھ علماء چاہتے ہیں۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ جناب کو معلوم ہے گذشتہ دَور میں جو بگاڑ بھی پیدا ہُوا، علمائے سُو کی بدبختی سے رُونما ہوا۔ اس معاملے میں خوب اچھی طرح دیکھ بھال کر کے دیندار علماء کا انتخاب فرمایا جائے۔ علمائے سُو دین کے چور ہیں۔ ان کا مقصد جاہ و مال اور خلقِ خدا کی نگاہوں میں قدر و منزلت

کا حصول ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ ان کے فتنے سے پناہ میں رکھے۔ ہاں ان میں جو اچھے ہیں وہ بہترین لوگ ہیں۔ انہی کی روشنائی قیامت کے روز شہدائے فی سبیل اللہ کے خون کے ساتھ وزن کی جائے گی اور اس روشنائی کا پلہ بھاری رہے گا شر الناس شر العلماء و خیر الناس خیر العلماء لوگوں میں سے بدتر، بُرے علماء ہیں اور لوگوں میں سب سے اچھے، اچھے علماء ہیں۔

بعض مقاصد کے پیش نظر فقیر آپ کے لشکر میں آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ مگر رمضان المبارک سر پر ہے اور یہ مُبارک مہینہ دہلی ہی میں گذارنے کا فیصلہ ہوا ہے۔ لبعد ازاں اللہ نے چاہا تو حاضرِ خدمت ہو جاؤں گا۔

(مکتوب ۱۹۴ دفتر اوّل)

شیخ فرید کے نام

(۱)

اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے بزرگ آباؤ اجداد کی راہ پر ثابت قدم رکھے۔ اول ان میں سے افضل سردارِ دوجہاںؐ پر اور پھر باقی ماندہ حضرات پر صلوٰۃ وسلام ہو۔

بادشاہ کو دنیا سے وہی تعلّق ہوتا ہے جو دل کو جسم سے۔ اگر دل صحیح وسالم ہو تو جسم بھی صحیح وسالم ہوتا ہے اور اگر دل فاسد ہو جائے تو جسم بھی فساد کا شکار ہو جاتا ہے۔ بادشاہ کی اصلاح سے دنیا کی اصلاح اور اس کے بگاڑ سے دنیا کا بگاڑ وابستہ ہوا کرتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ عہدِ ماضی میں اہلِ اسلام پر کیا کچھ نہیں بیتی۔ گزشتہ ادوار میں اسلام کی غربت اور کسمپرسی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ پھر بھی اہلِ اسلام کی حالت اس سے زیادہ زار وزبوں نہ تھی کہ وہ اپنے دین پر رہتے تھے اور کفّار اپنے مذہب پر۔ جیساکہ آیہ کریمہ لکم دینکم ولی دین کا مضمون ہے۔ لیکن عہدِ ماضی میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ کفّار تو اپنے استیلا اور غلبے کی بدولت دارالاسلام میں کفر کے احکام جاری کرتے تھے اور مسلمان احکام اسلام کے اظہار سے بھی قاصر تھے۔ اظہار کی جرأت کرتے تھے تو قتل کر دیے جاتے تھے۔

وائے افسوس! اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کے محبوب حضرت محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے والے تو ذلیل وخوار تھے اور ان کے منکر صاحبِ عزّت واعتبار۔ مسلمان مجروح دلوں کے ساتھ اسلام کے عزادار تھے اور دشمن تمسخر اور استہزا کر کے ان کے زخموں پر نمک چھڑکتے تھے۔ ہدایت کا آفتاب گمراہی کے پردے میں اور حق کا نورِ باطل کی تاریکی میں مستور تھا۔

آج کہ دولتِ اسلام کی ترقّی میں مانع اسباب کے زوال اور بادشاہِ اسلام کی تخت نشینی کی خوشخبری ہر خاص وعام کو پہنچی، اہلِ اسلام نے ضروری سمجھا کہ بادشاہ کے

ساتھ تعاون اور ترویجِ شریعت اور تقویتِ ملّت کے متعلق اس کی رہنمائی کریں۔ خواہ یہ امداد و تقویت زبانی ہو یا عملی۔ اولین امداد یہی ہے کہ مسائلِ شرعیہ اور کتاب و سنّت اور اجماع امت کے مطابق عقائدِ اسلامیہ کو واشگاف بیان کیا جائے تاکہ کوئی بدعتی اور گمراہ درآ کر غلط راستے پر نہ لے جائے اور کام کو بگاڑ نہ ڈالے۔ اس قسم کی امداد علمائے اہلِ حق سے مخصوص ہے آخرت جن کی توجہ کا مرکز ہوتی ہے۔ دنیا پرست علماء جن کی تگ و دو کا ہدف دنیائے دنی ہوا کرتی ہے ان کی صحبت زہرِ قاتل ہے اور ان کا بگاڑ متعدی بگاڑ ہے ؎

عالم کہ کامرانی و تن پروری کند
او خویشتن گم است کرا رہبری کند

زمانۂ ماضی میں جو مصیبت بھی نازل ہوئی اسی جماعت کی بدبختی کا ثمرہ تھی۔ ان لوگوں نے بادشاہوں کو غلط راہ پر ڈال دیا تھا۔ جن بہتّر فرقوں نے گمراہی کا شیوہ اختیار کیا ان کے پیشوا یہی علمائے سُو تھے۔ جب کوئی غیر عالم گمراہ ہوتا ہے تو اس کی گمراہی دوسرے لوگوں کو کم ہی متاثر کرتی ہے، لیکن ایک عالم کی گمراہی بے شمار لوگوں کی گمراہی کا موجب ہوتی ہے۔ ہمارے زمانے کے اکثر صوفی نما جہلا علمائے سُو کے حکم میں آتے ہیں۔ ان کا فساد بھی متعدّی ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بادشاہ کا قرب اور اس کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی استطاعت بخشی ہے۔ اس لیے جناب والا سے توقع ہے کہ خلوت و جلوت میں شریعتِ محمدی کی ترویج کی پوری کوشش کریں گے اور مسلمانوں کو غربت و بے چارگی کے عالم سے نکالیں گے۔

(مکتوب ۴۷، دفتر اوّل)

(۲)

ان اکابر (انبیاء و رسل) کی بعثت کا مقصد شریعت کی تبلیغ ہوتی ہے لہٰذا ترویجِ شریعت کی کوشش اور احکامِ الٰہیہ کا اجراء سب سے بڑی نیکی ہے۔ بالخصوص اس زمانے میں کہ اسلامی شعائر مٹا دیئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں کروڑوں روپوں کا انفاق بھی کسی ایک مسئلۂ شرعی کو رواج دینے کے برابر نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کام میں اللہ کی بزرگ ترین مخلوق انبیائے کرام کی اقتدا اور ان کے ساتھ یک گونہ مشارکت ہے اور یہ بات ثابت ہے کہ سب سے زیادہ نیکیاں انہی لوگوں کے حصے میں آتی ہیں۔ کروڑوں روپے تو اور لوگ بھی صرف کر سکتے ہیں۔ مشکل کام احکامِ شریعت کی بجا آوری ہے اور اس کے لیے نفس کی انتہائی مخالفت کرنا پڑتی ہے، کیونکہ شریعت کی سب سے زیادہ زد نفس ہی پر پڑتی ہے۔ پھر نفس بسا اوقات مال کے انفاق پر بھی رضامند ہو جاتا ہے، البتہ جو انفاقِ مال و دولت شریعت کی تقویت اور ترویج کے لیے کیا جائے اس کا بہت بڑا درجہ ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک کوڑی کا انفاق دوسرے مقاصد کے لیے لاکھوں روپے کے انفاق کے برابر ہوتا ہے۔

(مکتوب ۴۸ دفتر اول)

(۳)

حق سبحانہٗ و تعالیٰ سے دعا ہے کہ بزرگانِ اہلِ بیتِ نبوی ہی کی اولاد کے ذریعے سے شریعتِ غرّا کے ارکان اور ملّتِ بیضا کے احکام ترقی پکڑیں اور رواج پذیر ہوں۔ ع

کار این است غیر این ہمہ ہیچ

(بس کام یہی ہے اس کے سوا سب ہیچ ہے)

آج گمراہی کے اس گرداب میں غربائے اہلِ اسلام کو نجات کی امید اہلِ بیتِ خیر البشر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کشتی سے ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے۔ "مثل اہل بیتی کسفینۃ نوح من رکبھا نجا ومن تخلّف عنھا ھلک"۔ میرے اہلِ بیت کی مثال کشتیٔ نوح کی سی ہے جو اس میں سوار ہُوا اس نے نجات پائی اور جو اس سے پیچھے رہ گیا وہ ہلاک ہوا۔

اپنی ساری ہمتِ بلند کو اس کام میں لگا دیجئے کہ یہ سعادتِ عظمیٰ (ترویجِ شریعت اور احیائے ملّت) حاصل ہو۔ اللہ سبحانہ کی عنایت سے آپ کو جاہ و جلال اور عظمت و شوکت سب کچھ حاصل ہے۔ اگر شرفِ ذاتی کے ساتھ یہ دولت بھی میسّر آجائے تو گویا آپ میدانِ سعادت میں سب سے سبقت لے گئے۔ یہ حقیر شریعتِ حقّہ کی تائید و ترویج کے سلسلے میں اس قسم کی باتیں کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا قصد رکھتا ہے۔

(مکتوب ۱۵ دفترِ اوّل)

(۴)

سعادت پناہ مکرّم! آج اسلام بڑی بے چارگی اور غربت کے عالم میں ہے۔ آج، اگر ایک مزدور اس کی تقویت کی خاطر ایک کوڑی بھی خرچ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے کروڑوں میں خریدتے ہیں۔ دیکھنا ہے کہ اس دولت کی سعادت سے وہ کس شاہباز کو مشرّف فرماتے ہیں۔ ترویجِ دین اور تقویتِ ملّت کی سعی و جہد یوں تو ہر شخص کے لیے ہر حال میں اور ہر وقت رعنا و زیبا ہے، لیکن اسلام کی غربت اور بے چارگی کے اس دور میں آپ ایسے جوانمردانِ اہلِ بیت سے اس کا وقوع زیبا تر اور رعنا تر ہے۔ کیونکہ یہ دولت آپ ہی کے بزرگ خاندان کی خانہ زاد ہے۔ آپ حضرات کا اس سے تعلّق ذاتی نوعیّت کا ہے اور دوسرے لوگوں کا عرضی اور بالواسطہ۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حقیقی وراثت

اس کارِ عظیم کے حصول اور انجام وہی ہیں ہے ۔ ؎

گوئے توفیق وسعادت درمیان افگندہ اند
کس بمیدان در نمی آید سواراں را چہ شد

؎ پڑا میدان میں ہے گیند توفیق وسعادت کا
ہوا کیا ہے سواروں کو کوئی آگے نہیں بڑھتا

عہدِ ماضی میں کفر کی جو رسمیں پیدا ہوگئی تھیں ان کا آج جب کہ اہلِ کفر کی طرف بادشاہِ اسلام کا وہ رجحان نہیں رہا ہے، باقی رہنا مسلمانوں کے دلوں پر بے حد گراں ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ بادشاہِ اسلام کو ان بدکیشوں کی رسموں کی برائی سے آگاہ کریں اور ان کو مٹانے کی کوشش کریں۔ شاید ان کے باقی رہنے کا سبب یہ ہے کہ بادشاہِ اسلام ان کی قباحت سے بے خبر ہے ......

بہر حال مسائل شرعیہ کی حقیقت سے بادشاہ کو مطلع کرنا ضروری ہے۔ جب تک ایسا نہ ہوگا، علماء اور بادشاہ کے مقربین اس کے ذمہ دار ہوں گے۔ ایسی گفتگوؤں کی پاداش میں اگر تکلیف بھی اٹھانی پڑے تو بڑی سعادت ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے احکامِ شرعی کی تبلیغ میں کیا کیا مصائب وشدائد نہیں جھیلے اور کیا کیا رنج اور دکھ نہیں دیکھے۔ ان کے گُلِ سرسبد صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے: ما اوذی نبی مثل ما اوذیت۔ کسی نبی کو اتنی تکلیفیں نہیں دی گئیں، جتنی کہ مجھے دی گئیں۔

عمر بگذشت وحدیثِ دردِ ما آخر نشد
شب بآخر شد کنوں کوتہ کنم افسانہ را

عمر گذر گئی مگر ہمارا قصۂ درد پورا نہیں ہوا۔ رات تمام ہوگئی اب میں اس داستانِ غم کو ختم کرتا ہوں۔

(مکتوب ۱۹۳ دفترِ اوّل)

(۵)

الحمدللہ علیٰ ذالک۔ مسلمانوں کو اس سے بڑھ کر خوشخبری کیا ہوگی اور ماتم زدوں کو اس سے زیادہ مژدۂ جانفزا کون سا ہوگا، لیکن چونکہ یہ حقیر و عاجز اس مقصد کے لیے آپ کی خدمت میں متوجّہ ہے اس لیے اس سلسلے میں کچھ باتیں عرض کرنا اور لکھنا ضروری سمجھتا ہے۔ امید ہے کہ مجھے معذور گردانیں گے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ غرض مند دیوانہ ہوتا ہے۔

عرض یہ ہے کہ ایسے دیندار علما بہت تھوڑے ہیں جن کے دل جاہ و امارت کی محبت سے خالی ہوں اور جو ترویج شریعت اور حمایتِ ملّت کے سوا اور کوئی غرض نہ رکھتے ہوں۔ ان علماء میں اگر حُبِّ جاہ و منصب پیدا ہوگئی تو وہ ایک دوسرے کے حریف بن جائیں گے۔ ہر ایک اپنی فضیلت و علمیت جتائے گا۔ پھر وہ اختلافی باتوں کو بیچ میں لے آئیں گے اور انہیں بادشاہ کا تقرّب حاصل کرنے کا ذریعہ بنائیں گے۔ لامحالہ اس کام میں سخت مشکل پیدا ہو جائے گی۔ عہدِ ماضی میں علماء کے اختلافات ہی نے دنیا کو مصیبت میں ڈالا تھا اور اب پھر وہی معاملہ درپیش ہے۔ ترویج شریعت تو درکنار اندیشہ ہے کہ یہ تجویز پھر تخریبِ دین کا سبب نہ بن جائے۔ (اس سے نیز علمائے سُو کے فتنے سے خدا کی پناہ) اگر اس مقصد کے لیے ایک عالم منتخب کیا جائے تو بہتر ہے۔ اگر یہ عالمِ دین علمائے حق میں سے مل جائے تو سعادت و خوش بختی کے کیا کہنے کہ ایسے عالمِ حق کی صحبت تو اکسیر ہے، لیکن اگر ایسا عالم نہ ملے تو پھر اچھی طرح سوچ بچار کے بعد گروہِ علماء میں سے جس کو بہترین سمجھیں اسے اختیار کر لیں......

جس طرح کہ مخلوقِ خدا کی نجات علماء کے وجود سے ہے۔ اسی طرح دنیا کا خُسران بھی ان سے وابستہ ہے۔ بہترین علماء بہترین عالم ہیں اور ان میں سے بدترین، بدترینِ خلائق ہیں۔ دنیا کی ہدایت و گمراہی ان کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایک بزرگ نے ابلیسِ لعین کو دیکھا کہ بیکار اور مطمئن بیٹھا ہے۔ اس سے اس کا سبب پوچھا۔ بولا: اس زمانے کے علماء میرا کام انجام دے رہے ہیں اور دنیا کو بہکانے اور گمراہ کرنے کے لیے وہی کافی ہیں۔ ؎

عالم کہ کامرانی و تن پروری کند — او خویشتن گم است کرا رہبری کند

جو عالم اقبال مندی اور تن پروری کے کام میں گم ہے وہ اوروں کی رہبری کیا کریگا۔
الغرض اس سلسلے میں صحیح غور و فکر کے بعد اقدام کی ضرورت ہے۔ جب معاملہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو پھر اس کا کوئی مداوا ہونے نہیں پاتا۔

(مکتوب ۵۲ دفتر اوّل)

خان جہان کے نام

(۱)

حق سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کو جس دولت سے ممتاز کر رکھا ہے اور جس سے عام لوگ بے خبر ہیں، ممکن ہے خود آپ کو بھی اس کا احساس نہ ہو، وہ یہ ہے کہ ...... بادشاہِ وقت آپ کی بات سنتا اور مانتا ہے۔ یہ کیسی دولتِ بے بہا ہے کہ آپ موقع ومحل دیکھ کر اشارے کنایے سے یا صریح الفاظ میں کلمۂ حق یعنی اہلِ سُنّت والجماعت کے معتقدات کے موافق اسلامی تعلیمات بادشاہ کے گوش گذار کریں اور اہلِ حق کی باتیں حتیٰ الامکان ان تک پہنچائیں بلکہ ہمیشہ اس بات کے متلاشی اور منتظر رہیں کہ مذہبی ودینی گفتگو کا کوئی موقع اور تقریب پیدا ہوتا کہ اسلام کی حقّانیت اور کفر اور شیوۂ اہلِ کفر کو بیان کیا جا سکے ...... اب میں اصلی بات پر آتا ہوں اور کہتا ہوں کہ آپ جانتے ہیں بادشاہ رُوح کی مانند ہوتا ہے اور باقی انسان جسم کی مثال۔ اگر رُوح صالح ہوتی ہے تو جسم بھی صالح اور سالم رہتا ہے اور اگر رُوح میں کوئی بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے تو سارا جسم اس بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے؛ چنانچہ بادشاہ کی اصلاح کی کوشش کرنا تمام انسانوں کی اصلاح کی کوشش کرنے کے مترادف ہے۔ اور یہ اصلاح اسلامی تعلیمات کے اظہار سے ہو سکتی ہے۔ اس طرح کہ جب بھی موقع ہاتھ آئے اہلِ سُنّت والجماعت کے معتقدات کے موافق صحیح اسلامی تعلیمات بادشاہ کے کان میں ڈالی جائیں اور مخالفین کے مذاہب کی تردید کی جائے۔ اگر یہ دولت حاصل ہو جاتی ہے، تو گویا انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والسّلام کی وراثتِ عظمیٰ ہاتھ آ جاتی ہے اور آپ کو تو یہ دولت مفت مل رہی ہے اس کی قدر وقیمت

جانی چاہیئے۔

(مکتوب ۷۰، دفتر دوم)

(۲)

یہی خدمت جس پر آپ سرفراز ہیں اگر اس سے آپ شریعتِ مصطفویؐ کی ترویج واجراء کا کام لیں گے تو گویا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا کام کریں گے اور دینِ متین کو منوّر اور آباد کریں گے۔ ہم فقیر اگر سالہا سال تک اس راہ میں جدّوجہد کرتے ہوئے اپنی جان بھی دے دیں تب بھی آپ جیسے شاہبازوں کی بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتے۔

گوئے توفیق وسعادت درمیان افگندہ اند
کس بمیدان درنمے آید سواراں راچہ شد

توفیق وسعادت کی گیند سامنے ڈالدی گئی ہے۔ شاہسواروں کو کیا ہو گیا ہے کوئی بھی میدان میں نہیں اترتا۔

اللھمّ وفقنا لِما تحب وترضٰی۔ اے اللہ اپنی مرضیات کی توفیق عطا کر۔

(مکتوب ۵۴ دفتر سوم)

قید خانے اور لشکرِ شاہی سے

بنام

- ——— حضرت شیخ عبد الحق محدّث دہلوی
- ——— فرزندانِ گرامی
- ——— میر محمد نعمان بدخشی
- ——— شیخ بدیع الدّین
- ——— میرزا مظفّر خان
- ——— خواجہ محمّد معصوم
- ——— خواجہ حسّام الدّین احمد

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے نام

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الّذین اصطفےٰ۔ میرے مخدوم و مکرّم! مصائب و شدائد میں اگرچہ تکالیف اٹھانی پڑتی ہیں، تاہم اللہ تعالیٰ کی کرم فرمائیوں سے بہرہ ور ہونے کی امید ہوتی ہے۔ اس دنیا کی بہترین دولت غم و اندوہ اور اس دسترخوان کی بہترین خوش ذائقہ نعمت درد و الم ہے۔ ان شکرپاروں کو اللہ تعالیٰ نے تلخ دوا کے باریک خول میں لپیٹ دیا ہے اور اِس طریقے سے آزمائش و ابتلا کا راستہ کھول دیا ہے۔ سعادت مند لوگ ان کی شیرینی پر نظر رکھتے ہیں اور ان کی تلخی سے شیرینی کی طرح شاد کام ہوتے ہیں اور یہ تلخ صفراوی مزاج کے برعکس شیریں معلوم ہوتا ہے اور شیریں کیوں معلوم نہ ہو کہ محبوب کا ہر کام شیریں ہوتا ہے۔ البتہ بیمار کو وہ تلخ معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ وہ ماسوا اللہ کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے۔ خوش نصیب لوگ محبوب کی ایذا میں وہ لذّت و حلاوت پاتے ہیں جس کا وہ انعام میں تصور بھی نہیں کر پاتے۔ اگرچہ ایذا اور انعام دونوں محبوب کی جانب سے ہوتے ہیں۔ تاہم ایذا میں محبوب کے نفس کو کچھ بھی دخل نہیں ہوتا اور انعام میں نفس کی خواہش بھی شامل حال ہوتی ہے۔

ے هنیاً لارباب النّعیم نعیمها
وللعاشق المسکین ما یتجرّع

دنیا کی نعمتیں اربابِ نعمت کو مبارک ہوں اور عاشقوں کو درد و الم۔

اللّٰھم لاتحرمنا اجرھم ولاتفتنا بعدھُم۔ اے اللہ ہمیں اپنے نیک بندوں کے اجر سے محروم نہ رکھ اور ان کے بعد آزمائش میں نہ ڈال۔ جناب کا وجودِ مبارک غربتِ اسلام کے اس دور میں اہل اسلام کے لیے غنیمت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زندہ و سلامت رکھیں۔ والسّلام۔ (مکتوب ۲۹ دفتر دوم)

فرزندانِ گرامی کے نام

(قید خانے سے)

حمد و ستائش ہے اللہ تعالیٰ کی جو تمام کائنات کا پروردگار ہے، راحت و مسرت میں بھی اور رنج و مصیبت میں بھی، فراخی میں بھی اور تنگی میں بھی، عیش و آرام میں بھی اور تکلیف و عتاب میں بھی، رحمت میں بھی اور زحمت میں بھی، سختی میں بھی اور آسودگی و نرمی میں بھی، عافیت میں بھی اور آزمائش میں بھی اور سلام ہو اس ذاتِ پاک پر جس کی مثل کسی نبی کو ایذا نہیں دی گئی اور جس کی مانند کسی رسول کی آزمائش نہیں ہوئی۔ بنابریں وہ ذاتِ پاک رحمۃ اللعالمین اور سید الاولین والآخرین قرار پائی۔

فرزندانِ گرامی! اگرچہ ابتلاء اور آزمائش تلخ اور بے لطف ہوتی ہے لیکن اگر اس کا موقع آجائے تو نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اس وقت جبکہ خدا نے تم کو فرصت دی ہے اُس کا شکر بجالاؤ اور اپنے کام میں دھیان دو۔ ایک پل بھی اطمینان اور بے فکری سے نہ بیٹھو اور تین باتوں سے خالی نہ رہو (۱) قرآن کریم کی تلاوت (۲) ادائے نماز طول قرأت کے ساتھ (۳) کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کی تکرار۔ حرف لا سے ہوائے نفس کے معبودوں کی نفی اور اپنی اغراض اور خواہشات کو دفع کرنا چاہیئے۔ اپنی اغراض کی طلب کا مطلب اپنی الوہیت کا دعویٰ کرنا ہے۔ کسی قسم کی خواہش و غرض کو دل میں جگہ نہیں دینی چاہیئے اور نہ قوتِ خیال و تصوّر میں کسی قسم کی کوئی ہوس باقی رہنی چاہیئے تاکہ بندگی کی حقیقت آشکارا ہو۔ اپنی مراد چاہنا اپنے مولا و آقا کی مرضی و مراد سے انحراف اور اس کا حریف بننے کے مترادف ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی آقائی کی نفی کی جارہی ہے اور اپنے آپ کو مولا و آقا ثابت کیا جارہا ہے۔ اس بات کی قباحت کو خوب سمجھ کر اپنے دعوئ خداوندی کی نفی کرتے رہو تا آنکہ ہر قسم کی ہوا و ہوس سے بالکل پاک نہ ہو جاؤ اور اپنے مولا و آقا کی مرضی و مراد کے سوا کسی قسم کی مراد اور

خواہش باقی نہ رہے۔ اس طرح اللہ سبحانہ تعالیٰ کے فضل و عنایت سے امید ہے ابتلا اور مصیبت کے دنوں میں آسانی اور نرمی میسر آئے گی۔ دیگر ایام میں ہوا و ہوس سدِ سکندری ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا گوشہ نشین ہو کر اس کام میں مشغول ہو جاؤ کہ لمحاتِ فرصت غنیمت ہیں۔ فتنوں کے زمانے میں اللہ تعالیٰ تھوڑے سے عمل کو بھی بہت قرار دے کر قبول کر لیتے ہیں اور فتنوں کا زمانہ نہ ہو تو سخت ریاضتیں اور مجاہدے درکار ہوتے ہیں۔ حقیقت سے باخبر ہونا ضروری ہے ملاقات ہو یا نہ ہو۔ نصیحت یہی ہے کہ کوئی غرض اور ہوس باقی نہ رہے۔ اپنی والدہ کو بھی اس بات سے آگاہ کریں اور ان کی راہنمائی کریں۔

باقی اس زندگی کے احوال چونکہ گذر جانے والے ہیں اس لیے کیا بیان کیے جائیں۔ چھوٹوں پر دستِ شفقت رکھنا اور ان کو پڑھنے کی ترغیب دیتے رہنا اور جن لوگوں کے حقوق مجھ پر ہیں ان کو حتی الامکان میری جانب سے راضی رکھنا اور سلامتیٔ ایمان کی دعا سے میرے مددگار و معاون رہنا۔

بتاکید مکرّر لکھا جاتا ہے کہ اس وقت کو لاحاصل کاموں میں صرف نہ کرنا اور ذکرِ الٰہی کے سوا کسی بات میں مشغول نہ رہنا، خواہ کتابوں کا مطالعہ اور طلباء سے بحث و مذاکرہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ وقت ذکرِ الٰہی کا ہے۔ نفسانی خواہشات کو جو معبودانِ باطل ہیں حرفِ لا سے سرنگوں کر دو تاکہ اور کوئی غرض اور مقصود دل میں باقی نہ رہے، حتیٰ کہ میری رہائی کی خواہش بھی، جو اس وقت تمہارے اہم مقاصد میں سے ہے تمہارا مقصود و مطلوب نہ رہنی چاہیئے اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر، اس کے فعل اور ارادے پر راضی رہو۔

اور کلمہ طیبہ کے اثباتی جزو میں ذاتِ غیب کے سوا، جو تمام معلومات اور تصورات و خیالات سے بھی وراء الورا ہے، تمہارا کچھ مقصود نہ ہو۔ حویلی، سرائے، چاہ، باغ کتابوں اور دوسری چیزوں کی فکر تو آسان ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی تمہارے وقت میں مزاحم نہ ہونی چاہیئے۔ اور رضائے حق کے سوا تمہارے سامنے اپنی کوئی غرض اور مرادِ نہ ہونی چاہیئے۔

اگر ہم مر جاتے تو یہ سب چیزیں جاتی رہتیں - اگر ہماری زندگی ہی میں جاتی رہیں تو تم ان کی فکر نہ کرو - اولیاء اللہ خود اپنے ارادہ و اختیار سے ان چیزوں سے دستبردار ہو گئے ہیں - ہم اللہ تعالیٰ کے ارادہ و اختیار سے ان کو خیر باد کہہ دیں اور شکر بجا لائیں - پھر امید ہے مخلصین میں شمار ہوں گے -

جس جگہ بیٹھے ہو اسی کو اپنا وطن سمجھو چند روزہ زندگی جہاں بھی گذرے یادِ حق میں گذرے - دنیا کے معاملات تو آسان ہیں آخرت کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے - اپنی والدہ کو تسلی اور آخرت کی ترغیب دینا - باقی رہی ملاقات تو اگر حق تعالیٰ کو منظور ہے تو ہو جائے گی - ورنہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پہ راضی رہنا اور دعا کرنا کہ ہم جنت میں اکٹھے ہوں - ملاقاتِ دنیا کی تلافی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم ملاقاتِ آخرت کے حوالے کرتے ہیں -
الحمد للہ علیٰ کل حالٍ -

(مکتوب ۲۰ دفتر سوم)

میر محمد نعمان بدخشی کے نام

(۱)

میرے سیادت پناہ بھائی میر محمد نعمان کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ میرے خیر اندیش دوستوں نے میری رہائی کے اسباب پیدا کرنے کی ہر چند کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اللہ نے جو کچھ کیا وہی بہتر ہے۔ تقاضائے بشریت کی بنا پر میں بھی کچھ رنجیدہ اور دل گرفتہ ہوا، مگر کچھ ہی مدت بعد حق جل سلطانہ کے فضل سے سارا غم و حزن اور دل گرفتگی فرحت و انبساط اور شرح صدر میں تبدیل ہو گئی اور یقینِ خاص سے جان لیا کہ میرے درپئے آزار جماعت کا مقصد اگر حق جل سلطانہ کے ارادے کے مطابق ہے تو پھر ناپسندیدگی اور دل گرفتگی بے معنی اور دعوئ محبت کے منافی ہے، کیونکہ محبوب کا ایلام اس کے انعام ہی کی طرح محب کو مرغوب و محبوب ہوتا ہے۔ محب جس طرح انعام سے لذت یاب ہوتا ہے اسی طرح اس کے ایلام سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے ایلام میں زیادہ مزہ پاتا ہے کہ یہ صورت نفس کی لذت اور خواہش کے شائبے سے بھی پاک ہوتی ہے اور جب حضرتِ حق سبحانہ و تعالیٰ جو جمیلِ مطلق ہے اس شخص کو تکلیف میں رکھنے ہی پر راضی ہے تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ بھی اس شخص کی نظر میں عنایتِ خداوندی سے جمیل ہے بلکہ لطف اندوز ہونے کا سبب ہے اور چونکہ اس جماعت کا مقصد حق سبحانہ کے مقصد کے مطابق ہے اور یہ مقصد اللہ تعالیٰ کے مقصد کے ظاہر ہونے کا دروازہ ہے اس لیے اس جماعت کا مقصد بھی اس کی نظر میں مستحسن اور لطف اندوزی کا باعث ہونا چاہیئے۔ جس شخص کا فعل محبوب کے فعل کا مظہر ہو تو اس کا وہ فعل بھی محبوب کے فعل کی طرح محبوب ہوتا ہے اور اس فعل کا کرنے والا بھی اس تعلق سے محب کی نظر میں محبوب ہوتا ہے۔

یہ بڑا عجیب معاملہ ہے۔ یہ شخص جتنی زیادہ جفا کرتا ہے محب کی نظر میں اتنا ہی حسین معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس صورت میں غضبِ محبوب کی زیادہ مانندگی ہوتی ہے۔ اس راہ کے دیوانوں کا معاملہ ہی الٹ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس شخص کی برائی چاہنا اور اس سے بددل ہونا محبّتِ محبوب کے منافی ہے۔ کیونکہ یہ شخص محبوب کے فعل کا آئینہ ہے اور کچھ نہیں۔ اس لیے جو لوگ درپئے آزار ہیں محبوب کی نظر میں باقی خلقت کی نسبت زیادہ محبوب نظر آنے چاہئیں۔

بنابریں دوستوں سے کہہ دیجئے کہ وہ دل گرفتگی کو رفع کریں اور جو لوگ درپئے آزار ہیں ان کا بُرا نہ چاہیں بلکہ ان کے اس طرزِ عمل سے لطف اندوز ہوں۔ ہاں چونکہ ہمیں دعا کرنے کا حکم ہے اور اللہ تعالیٰ کو بندے کی دعا، التجا اور تضرّع وزاری پسند ہے۔ اس لیے دفعِ آفات کی دعا کریں اور اس سے معافی اور عافیت طلب کریں۔

اور میں نے (جفا و آزار کو) صورتِ غضب کا آئینہ اس لیے کہا ہے کہ حقیقتِ غضب دشمنوں کا حصہ ہے۔ دوستوں کے لیے صورتِ غضب مخصوص ہے اور یہ فی الحقیقت عین رحمت ہوا کرتی ہے۔ اس صورتِ غضب میں محب کے لیے ایسے فوائد ودیعت رکھے گئے ہیں کہ ان کی کیا تفصیل بیان کی جائے۔ نیز صورتِ غضب میں جو دوستوں کو عطا کی جاتی ہے منکروں کی بربادی کا سامان اور ان کی ابتلاء کا باعث ہے۔ شیخ محی الدّین عربی قدس سرہ کی عبارت کا مطلب آپ کو معلوم ہوگا فرمایا ہے کہ عارف میں ہمّت نہیں ہوتی، یعنی وہ ہمّت جو دفعِ مصیبت کا قصد کرے، عارف سے مسلوب ہوتی ہے۔ کیونکہ جب عارف مصیبت کو محبوب کی جانب سے سمجھتا ہے اور اسے محبوب کا مقصود اور خواہش گردانتا ہے، تو اس کو رفع کرنے کی ہمّت اور خواہش کیسے کر سکتا ہے۔ اگرچہ بظاہر زبان سے اُس کے دور ہونے کی دعا کرتا ہے۔ یہ محض حکمِ دعا کی تعمیل کے لیے کرتا ہے ورنہ حقیقت میں وہ کچھ نہیں چاہتا اور جو مصیبت اُسے پہنچتی ہے اس سے لطف

اندوز ہوتا ہے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

(مکتوب ۱۵ دفتر سوم)

(۲)

پوشیدہ نہ رہے جب تک اللہ سبحانہ تعالیٰ کی عنایت سے جو اس کے جلال و غضب کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، قفس زنداں میں محبوس نہ ہوا تھا، ایمانِ شہودی کی تنگنائے سے پوری طرح رہائی نہیں پائی تھی اور سایہ ہائے خیال و مثال کے کوچوں سے باہر نہ نکلا تھا، اور قادرِ مطلق پر ایمان بالغیب رکھنے کی شاہراہ پر گامزن نہ ہوا تھا اور حضورؐ سے غیب کے ساتھ، عین سے علم کے ساتھ اور شہود سے استدلال کے ساتھ پوری طرح پیوستہ نہ ہوا تھا۔ اور دوسروں کے ہنر کو عیب اور دوسروں کے عیب کو ہنر، کمالِ ذوق اور وجدانِ رسا کے ساتھ نہ سمجھ پایا تھا اور بے ننگی و بے ناموسی کا خوشگوار شربت اور خواری و رسوائی کا لذیذ مربہ نہ چکھا تھا، خلقِ خدا کی طعنہ زنی اور ملامت کے جمال سے محظوظ اور لوگوں کی جفا کاری اور ایذادہی کے حسن سے لطف اندوز نہ ہوا تھا، مُردہ بدست زندہ (کالمیت بین یدی الغسال) بن کر ارادہ و اختیار سے پوری طرح دستبردار نہ ہوا تھا، آفاق والنفس کے ساتھ تعلقات کے بندھن مکمل طور پر نہیں کاٹے تھے اور تضرع، التجا، انابت، استغفار، ذلت اور انکسار کی حقیقت ہاتھ نہ آئی تھی اور استغنائے حق تعالیٰ کی بلند مرتبت میزان جو عظمت و کبریائی کی تناتوں سے محیط ہے، مشاہدہ میں نہ آئی تھی اور اپنے کو ایک ذلیل و خوار، بے اعتبار و بے ہنر، بے اقتدار اور سراپا محتاج و فقیر بندہ نہ سمجھ سکا تھا۔ وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (میں اپنے نفس کی برأت نہیں کرتا،

نفس تو بدی پر اکستا تا ہی ہے الّا یہ کہ میرا رب ہی کسی پر رحمت کرے۔ بے شک میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے) اس غم کدے میں اگر محض فضلِ الٰہی سے فیوض و وارداتِ الٰہی کا پے بہ پے ظہور اور اس کے لامتناہی انعامات و عطیات مجھ شکستہ بال و پر فقیر کے شاملِ حال نہ ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ معاملہ یاس و نامرادی تک پہنچ جاتا اور امید کا رشتہ ٹوٹ جاتا۔ حمد ہے اس اللہ کی جس نے مجھے عین بلا میں عافیت عطا فرمائی اور ظلم و جفا میں عزت و اکرام سے نوازا اور رنج اور مصیبت کی حالت میں مجھ پر احسان فرمایا اور راحت و سختی میں شکر کی توفیق بخشی اور انبیا کی اتباع کرنے اولیاء کے نقوشِ قدم پر چلنے اور علماء و صلحاء سے محبت رکھنے والوں میں سے بنایا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں سایہ گستر ہوں اوّل انبیاء پر اور ثانی ان کے متبعین پر۔

(مکتوب ۵ دفتر سوم)

شیخ بدیع الدّین کے نام

الحمد للّٰہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذّین اصطفےٰ۔ نامۂ عالیہ جو آپ نے شیخ فتح اللّٰہ کے ہاتھ ارسال کیا تھا، پہنچا۔ آپ نے لوگوں کی ملامت اور جفاؤں کے متعلّق تحریر فرمایا تھا۔ یہ تو اس گروہ (سالکین) کا حسن وجمال اور اس کے زنگ کے لیے آب و جِلا ہے۔ پھر دل گرفتگی اور ملال ورنجش کا باعث کیوں ہو؟ جب یہ فقیر اس قافلے میں پہنچا تھا تو شروع ہی سے محسوس ہوتا تھا کہ لوگوں کی ملامت کے انوار شہروں اور دیہاتوں سے نورانی بادلوں کی صورت میں پے در پے چلے آتے ہیں اور میرے معاملے کو پستی سے بلندی کی طرف لیے جاتے ہیں۔ برسوں تربیتِ جمالی سے میری منزلیں طے کروائی گئیں اور اب تربیّتِ جلالی سے قطعِ مسافت کرائی جا رہی ہے۔ لہٰذا آپ مقامِ صبر بلکہ مقامِ رضا میں رہیں اور جمال وجلال کو مساوی جانیں۔

آپ نے تحریر فرمایا تھا جب سے فتنہ کا ظہور ہوا ہے نہ ذوق باقی رہا ہے نہ حال۔ حالانکہ ذوق وحال دوگنا چوگنا ہونا چاہیئے تھا اس لیے کہ محبوب کی جفائیں اس کی وفاؤں سے زیادہ لذّت بخش ہوتی ہیں۔ یہ کیا مصیبت پڑی کہ آپ نے عوام کے رنگ میں کلام کیا ہے اور محبتِ ذاتیہ سے دور چلے گئے ہیں۔ لہٰذا اب گذشتہ بات کے برخلاف جلال وایلام (تکلیف) کو انعام سے زیادہ تصوّر کریں۔ اس لیے کہ جمال وانعام میں محبوب کے مدّعا کے ساتھ خود اپنی غرض بھی شامل ہوتی ہے اور جلال وایلام میں اپنی غرض کے خلاف خالصتہً محبوب کا مدّعا سامنے ہوتا ہے۔ اس وقت جو کیفیّت وحال ہے وہ پہلی کیفیت وحال سے کچھ سوا ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ آپ نے زیارتِ حرمین شریفین کے متعلّق تحریر کیا تھا۔ اس میں کیا رکاوٹ ہے؟ حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل (ہمارے لیے اللّٰہ کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے)

(مکتوب ۷ دفتر سوم)

میرزا مظفّر خان کے نام

دنیوی مصائب اور آزمائشوں کا نزول دوستوں کے لیے ان کی لغزشوں کا کفّارہ ہے تضرع و زاری، التجا اور عجز و انکسار سے بارگاہِ قدسی تعالیٰ میں بخشش اور سلامتی طلب کرنی چاہیئے - یہاں تک کہ قبولیت کے آثار ہویدا ہوں اور فتنوں سے اطمینان و تسکین ملے - اگرچہ میرے دوست اور بہی خواہ اس کام میں مشغول ہیں؛ تاہم صاحبِ معاملہ اس کام کا زیادہ حقدار ہے۔ دوا کھانا اور پرہیز کرنا مریض کا کام ہوتا ہے - دوسرے لوگ ازالۂ مرض میں بس اس کے مددگار ہوتے ہیں - حقیقتِ معاملہ یہ ہے کہ محبوبِ حقیقی کی طرف سے جو تکلیف بھی پہنچے اسے خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے بعد شکر و احسان قبول کرنا چاہیئے بلکہ اس سے لذّت اندوز ہونا چاہیئے - وہ رسوائی اور بے ناموسی جو محبوب کو مطلوب ہو اس ناموس اور ننگ و نام سے بہتر ہوتی ہے جسے اپنا نفس چاہتا ہے - اگر محب میں یہ بات پیدا نہ ہو تو وہ اپنے دعوئ محبت میں کھوٹا بلکہ جھوٹا ہے - ؎

گر طمع خواہد زمن سلطانِ دیں
خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

(اگر سلطانِ دیں مجھ سے طمع کا خواہشمند ہے تو پھر قناعت کے سر پر خاک ہے)

(مکتوب ۵۷ دفتر دوم)

صاحبزادگان کے نام

(رہائی کے بعد دربار سے)

(۱)

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الّذی اصطفٰی۔ اس جگہ کے حالات لائقِ حمد وسپاس ہیں۔ شب وروز عجیب وغریب صحبتوں میں گذر رہے ہیں۔ اللہ کے فضل وعنایت سے دینی امور اور اسلامی اصولوں کے سلسلے میں جو مذاکرات اور گفتگوئیں ہوتی ہیں ان میں ذرا بھر غفلت اور مداہنت راہ نہیں پاتی۔ وہی باتیں جو خلوتوں اور خصوصی مجلسوں میں ہوتی ہیں اللہ پاک کی توفیق سے ان معرکوں میں بیان ہو رہی ہیں۔ ایک مجلس کا ذکر بھی کروں تو دفتر درکار ہے۔ خصوصاً آج رات کہ رمضان المبارک کی پندرہویں رات تھی بادشاہ کے سامنے انبیأ علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مقصدِ بعثت، عقل کی ناپختگی، ایمان بالآخرت، اس کے عذاب وثواب، اللہ تعالیٰ کے دیدار، ختمِ نبوت، ہر صدی کے مجدد، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی پیروی، تراویح کی سُنّتوں، تناسخ کے باطل ہونے، جن اور جنیوں کا ذکر اور ان کے عذاب وثواب کا مسئلہ اور اسی نوعیت کے بہت سے مسائل کا ذکر رہا۔ بادشاہ بحسن وخوبی سنتے رہے۔ اسی ضمن میں ابدال وقطب اور اوتاروں وغیرہ کا ذکر بھی ہوا۔ الحمد للہ کہ (بادشاہ) دل جمعی سے سنتے رہے اور کسی قسم کا کوئی تغیّر ان کی حالت میں رونما نہ ہوا۔ اس ملاقات اور بیانِ واقعات میں شاید حق تعالیٰ کی مصلحتیں اور اسرار پوشیدہ تھے۔ الحمد للّٰہ الذی ھدانا لھٰذا وَمَا کُنَّا لنھتدی لولا ان ھدانا اللّٰہ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بالحق۔ اللہ کی حمد وسپاس ہے۔ جس نے ہماری اس بات کی طرف راہنمائی کی اور اگر اللہ ہماری رہنمائی نہ فرماتا تو ہم اس راہ کو نہ پا سکتے۔ بلاشبہ ہمارے رب کے رسولؐ حق لے کر آئے۔

دیگر یہ کہ ختمِ قرآن سورۂ عنکبوت تک پہنچ چکا ہوں۔ رات کو اس مجلس میں سے

اٹھ کر آتا ہوں تو تراویح میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ حفظِ قرآن کی یہ دولتِ عظیم ان پریشانیوں میں، جو عین جمعیت تھی، حاصل ہوئی۔ الحمدللہ اولاً و آخراً۔

(مکتوب ۴۳ دفتر سوم)

(۲)

(لشکر سے)

فرزندانِ گرامی! دل جمعی سے رہو۔ لوگ ہر وقت ہماری تکالیف پر نظر رکھتے ہیں اور اس مشکل سے نجات چاہتے ہیں۔ نہیں جانتے کہ نامرادی، بے اختیاری اور ناکامی میں کس بلا کا حسن و جمال ہے اور اس کے برابر کونسی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو اُس کے اختیار اور ارادے سے محروم کر کے بے اختیار کر دیں، اپنے اختیار سے اُس کو زندگی بخش دیں، اس کے اختیاری امور کو بھی اس بے اختیاری کا تابع کر کے اُسے اپنے دائرۂ اختیار سے باہر نکال دیں اور مردہ بدستِ زندہ بنا کر رکھ دیں۔ زمانۂ قید میں جب بھی میں اپنی ناکامی و بے اختیاری پر غور کرتا تھا عجیب لطف اٹھاتا اور طرفہ مزہ پاتا تھا۔ ہاں جو لوگ آسودگی اور بے فکری سے مالا مال ہیں انہیں اربابِ بلا کی لذت کی کیا خبر اور اس کی مصیبت کے حُسن و جمال کی کیا تمیز۔ بچوں کو تو صرف شیرینی ہی میں مزہ آتا ہے لیکن جو تلخی ہی سے لطف اندوز ہوتا ہے وہ شیرینی کو ایک جَو میں بھی نہیں خریدتا۔ ع

مرغِ آتش خوارہ کے لذّت شناسد دانہ را

(مرغ آتش خور دانہ کی لذّت کو کیا جانے)

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

(مکتوب ۸۲ دفتر سوم)

(۳)

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ - فرزندانِ گرامی اگرچہ ہماری صحبت دوام کے مشتاق وخواہاں ہیں اور ہمیں بھی ان سے ملاقات کی آرزو ہے، لیکن کیا کیا جائے، تمام امیدیں کہاں حاصل ہوا کرتی ہیں؟ ع

تجری الرّیاحُ بما لا تشتہی السُّفُنُ

(ہوائیں اکثر سفینوں کی خواہش کے مخالف چلا کرتی ہیں)

لشکر میں ہمارا یہ غیر اختیاری اور بے خواہش قیام بے حد فائدہ مند ہے۔ یہاں کی ایک ساعت دوسرے مقامات کی بہت سی ساعتوں سے بہتر نظر آتی ہے۔ یہاں وہ کچھ میسر ہے جو دوسرے مقامات پر نہیں ہوتا۔ یہاں کے علوم ومعارف اور اس مجمع کے احوال ومقامات بالکل نرالے ہیں۔ بادشاہ کی طرف سے جو تکلیف ہے اُسے اپنے بزرگ و برتر آقا کی کمال مہربانی اور رضامندی کا دروازہ سمجھتا ہوں اور اس قید کو اپنے لیے باعثِ سعادت گردانتا ہوں۔ بالخصوص جنگ وجدال کے ان ایّام میں عجیب ہی معاملہ ہے۔ ان پریشان اوقات میں عجیب وغریب کرشمے ظاہر ہوتے ہیں اور ہر روز تازہ اور عجیب دولت میسر آتی ہے۔

(مکتوب ۸۷، دفتر سوم)

(۴)

(خواجہ محمد معصوم کے نام)

ان اطراف کے احوال وکوائف لائقِ حمد ہیں اور تمہاری استقامت اور سلامتی حق تعالےٰ سے مطلوب ہے۔ اجمیر پہنچ کر راستے کی تکالیف اور گرمیوں سے کچھ نجات ملی تو انشاء اللہ تعالےٰ

تمہیں لکھ کر بلا لوں گا۔ جمعیتِ خاطر رکھو۔ حق تعالیٰ کی رضا جوئی میں کوشاں رہو۔ بے فکری اور راحت طلبی ترک کرو۔ حظِ نفس کے پیچھے نہ پڑو۔ اہل وعیال کی محبت میں بالکل ڈوب کر نہ رہ جاؤ۔ ایسا نہ ہو اس ضروری کام میں خرابی پیدا ہو جائے اور پھر ندامت اور حسرت و یاس کے سوا کچھ پلے نہ پڑے۔ اس صحبت و دولت کو غنیمت جانو اور امورِ ضروری میں عمر بسر کرو ...... حق تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا و تضرّع کرتے رہو۔ اہلِ حقوق کے ساتھ بقدرِ ضرورت میل جول رکھو۔ ان کی خاطر مدارات بجا لاؤ۔ مستورات کو وعظ و نصیحت کرتے، انہیں بھلے کاموں کی دعوت دیتے اور منکرات سے بچنے کی بلا تامل نصیحت کرتے رہو اور تمام گھر والوں کو نماز، نیکی اور احکام شرعی بجالانے کی ترغیب دیتے رہو فانّکم مسئولون عن رعیتکم (کیونکہ تم سے اپنی اپنی رعیت کے بارے میں باز پرس کی جائے گی) حق تعالیٰ نے تم کو علم دیا ہے، اس کے مطابق عمل بھی نصیب کرے اور اُس پر ثابت قدم رکھے۔ آمین

(مکتوب ۸۵ دفتر سوم)

(۵)

فرزندانِ گرامی کو ظاہری اور باطنی اطمینان و آسودگی میسّر ہو۔ اس محنت طلب سفر میں ان دونوں بیٹوں کی جدائی کا بےحد رنج والم رہتا ہے۔ کسی وقت بھی ان کی یاد سے فارغ نہیں ہوتا۔ منعمِ حقیقی جلّ شانہٗ جس قدر زیادہ نعمت و سعادت سے نوازتا ہے، دور افتادہ دوست اتنے ہی زیادہ یاد آتے ہیں۔ روزانہ تازہ واقعات بیاض میں لکھے جاتے ہیں، لیکن کوئی نہیں جو ان کا ادراک کر سکے اور ان سے حظ اٹھائے۔ خواجہ محمدؐ ہاشم کا وجود غنیمت ہے جو سخن فہمی کا ذوق رکھتے ہیں اور کچھ نہ کچھ لذّت یاب ہوتے ہیں، لیکن اس سفرِ اجمیر کے مصائب و شدائد کے باعث دور در ماندہ دوستوں کی یاد ستانے لگی ہے۔ شاید چند دن اور ساتھ دیں۔ حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل۔

(مکتوب ۸۲ دفتر سوم)

خواجہ حسام الدین احمد کے نام

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ والذین اصطفیٰ .... اس طرف کے فقیروں کے احوال وکوائف لائقِ حمد ہیں کہ عین مصیبت وبلا میں امن وآسودگی اور عین تفرقہ میں اطمینان میسر ہے جو فرزند ودوست ہمراہ ہیں ان کے اوقات بھی اطمینان سے گذر رہے ہیں اور ان کے احوال میں ترقی ہو رہی ہے ۔ الغرض لشکر ان کے حق میں خانقاہ مشخص ہے ۔ لشکریوں کی تلون مزاجیوں میں انہیں تمکنت حاصل ہے اور عین ان گونا گوں قیود اور گرفتاریوں میں جو اس مقام سے وابستہ ہیں ، بس ایک ہی مقصد کے گرفتار ہیں ۔ کسی سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ـــــ یہ قید ایک عجیب نوعیت کی قید ہے جس کے عوض جو کے برابر رہائی اور نجات کو بھی خریدنے کے لیے تیار نہیں ـــــ الحمد للہ سبحانہ والمنۃ علیٰ ذالک وعلیٰ جمیع نعمآئہٖ - ....

الحمد للہ کہ باوجودیکہ اربابِ تفرقہ سے بہت میل جول ہے ، لیکن اللہ تعالیٰ کے کرم سے ہمراہیوں میں سے کسی کو ابھی تک تفرقہ کی نوبت نہیں پہنچی اور مطلب ومقصد سے نہیں روکا ۔

(مکتوب ۷۲ ، دفتر سوم)

شخصیات

الف

۱۔ ابنِ عربی

نام شیخ ابوبکر محی الدین بن محمد ابنِ علی۔ ابن العربی (ابنِ عربی) اور شیخِ اکبر کے نام سے مشہور ہیں۔ سنہ ۵۶۰ھ (سنہ ۱۱۶۵ء) میں اندلس کے شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے۔ عرب کے قدیم قبیلے طے سے تعلق رکھتے تھے۔ سنہ ۵۶۸ھ میں اِشبیلیہ میں منتقل ہو گئے۔ جو اس زمانے میں اندلس کے بڑے بڑے علمی مراکز میں شمار ہوتا تھا۔ ابنِ عربی یہاں تیس سال تک رہے اور اپنے زمانے کے مشاہیر علماء سے اکتسابِ علم کیا۔ یہیں آپ نے طریقِ تصوّف میں مختلف شیوخ سے فیض حاصل کیا۔ آگے چل کر شیخ نے تصوّف کو جو نظریہ دیا، وہ اسی زمانۂ تربیت کی پیداوار تھا۔ تحصیلِ علم کے بعد بلادِ مشرق کی سیر و سیاحت کو نکل کھڑے ہوئے، پہلے مصر گئے اور وہاں کچھ عرصے تک مقیم رہے۔ پھر مشرقِ قریب اور ایشیائے کوچک کی ایک مدت تک سیاحت کرتے رہے۔ بیت المقدس، مکّہ معظمہ، بغداد اور حلب سے ہوتے دمشق پہنچے اور مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہیں سنہ ۶۳۸ھ میں وفات پائی اور جبل قاسیون میں مدفون ہوئے۔

ابنِ عربی کے متعلق ابتداء ہی سے علماء میں اختلاف چلا آتا ہے۔ علماء کے ایک طبقے کے نزدیک وہ ولیِ کامل اور قطبِ دوراں ہیں، صوفیاء کے حلقے میں تو وہ شیخِ اکبر کہلاتے ہیں۔ اس کے نزدیک ان کی تصانیف بالخصوص فتوحاتِ مکیہ اور فصوص الحکم طریقِ تصوّف کی امہات الکتب ہیں جن کے مطالعے اور تتبّع کے بغیر اس کوچے کے اسرار و غوامض سے آشنا اور بہرہ مند نہیں ہوا جا سکتا۔ دوسرا حلقہ انہیں ضالّ اور مضلّ گردانتا ہے۔ اس کے نزدیک ان کی کتابیں الحاد اور ضلالت کا منبع ہیں۔ اوّل الذکر طبقے میں فخر الدین رازی، جلال الدین سیوطی، مجد الدین فیروز آبادی اور عبدالوہاب الشعرانی ایسے لوگ ہیں اور

مؤخر الذکر طبقے میں عز الدین عبدالسلام، قطب الدین قطلانی، ابوالعباس المشاربی امام ابنِ تیمیہ، امام ذہبی، حافظ ابنِ حجر، سخاوی اور ملا علی قاری وغیرہم ہیں۔

امام ابنِ تیمیہ ایک مکتوب میں ابنِ عربی کے پیروکار اور مظفر بیبرس جاشنگیر کے شیخ طریقت نصر منبجی کو لکھتے ہیں:

"عرصہ ہوا مجھ کو ابنِ عربی سے بہت حُسنِ ظن تھا اور میں ان کی عزت کرتا تھا۔ کیونکہ فتوحاتِ مکیہ وغیرہ ان کی کتابیں بڑے عمدہ فوائد پر مشتمل ہیں ـــــ مگر میں نے اس وقت تک فصوص الحکم نہیں دیکھی تھی، فصوص دیکھنے کے بعد مجھ پر ان کی اصل حیثیت منکشف ہوئی" (مجموعۃ الرسائل والمسائل ص ۱۷۱ - ج ۱)

اس کے بعد فصوص الحکم کی عبارتیں نقل کرتے ہیں اور ان پر سخت نقد کر کے لکھتے ہیں۔ واللہ اعلم بما مات الرجل علیہ[1] - (یعنی اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کا خاتمہ کس حالت پر ہوا ہے)

ابنِ عربی تصوف میں ایک نئے مکتبِ فکر کے بانی ہیں - وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے فلسفۂ جبر کو وحدت الوجود کی صورت میں پیش کیا ــــ مصر کے مشہور محقق عالم محمد ابوزہرہ نے اس فلسفے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"صوفیہ کا تیسرا مذہب وحدت الوجود ہے: جس کا مدعا یہ ہے کہ موجود صرف ایک ہی ہستی ہے۔ تعدد جو واقع میں نظر آتا ہے، یہ وجود کی شکل کا تعدد ہے نہ کہ ذات موجود کا۔ اس مکتبِ فکر کا پرچم ابنِ عربی کے ہاتھ میں ہے جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ یہ وسیع زمین اور محیط آسمان اور اس میں تیرنے والے ستارے یہ سب تجلیات الٰہیہ کی صور و اشکال ہیں۔ ساری کائنات (معاذ اللہ) خدا ہی میں گم ہے۔ ابنِ عربی نے ایک جگہ خود کہا ہے۔ ے

[1] حیاتِ امام ابنِ تیمیہ محمد ابوزہرہ ترجمہ رئیس احمد جعفری حاشیہ ص ۹۱ - ۵۱۵

یا خالق الاشیاء فی نفسه
انت لما تخلقه جامع
تخلق ما ینتھی کونه
فیک فانت الضیق الواسع

(یعنی اے سب چیزوں کو اپنی ذات میں پیدا کرنے والے، تو ہی اپنی مخلوق کا جامع ہے۔ تیری مخلوق تجھ ہی میں جاکر گم ہو جاتی ہے، تو تنگ بھی ہے اور وامع بھی)[1]

امام ابن تیمیہؒ ابن عربی کے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وہ اصل جس پر انہوں نے اپنے مسلک کی بنیاد قائم کی ہے، یہ ہے کہ تمام مخلوقات اور مصنوعات کا وجود، یہاں تک کہ جن، شیطان، کافر، فاسق، کتا، سور، نجاست، کفر، فسق اور گناہ یہ سب خدا کا عین وجود ہیں نہ یہ خدا کی ذات سے متمیز ہیں اور نہ منفصل۔ یعنی انہیں نہ ذات خداوندی سے الگ کیا جا سکتا ہے نہ خدا کی ذات میں اور ان میں کسی طرح کا فرق کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ چیزیں مخلوق ہیں، موجوب ہیں، مصنوع ہیں، لیکن یہ ذات خداوندی کے ساتھ پیوستہ اور قائم ہیں اور کائنات میں یہ تفریق اور کثرت جو نظر آتی ہے، یہ حس اور عقل کا ظاہری پہلو ہے۔ اس طرح انہوں نے ایسی وحدت پیدا کرنی چاہی جو کثرت کو زائل کر دے اور وحدت کو اس طرح جمع کرنا چاہا جو اثبات کے ثبوت تفرق کے ساتھ اس کو اٹھا دے"۔[2]

ابن عربی کے مسلک و نظریہ کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"صاحب فصوص الحکم اور ان کے ہم نوا اس پر تلے ہوئے ہیں کہ ایمان کے

۱۔ حیات شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ ترجمہ رئیس احمد جعفری ص ۳۰۸

۲۔ ایضاً ص ۵۱۵

تینوں اصولوں کو منہدم کر کے رکھ دیں۔ ایمان کے وہ تینوں اصول یہ ہیں :

۱۔ خدائے واحد و یکتا پر ایمان رکھنا۔

۲۔ خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں اور نبیوں پر ایمان لانا۔

۳۔ یوم آخرت پر ایمان رکھنا۔

اور ان کا حال یہ ہے کہ ایمان باللہ کی شکل انہوں نے یوں بگاڑی ہے کہ کہتے ہیں کہ خدا کا وجود اور عالم کا وجود ایک ہی ہے۔ اس عالم کا صانع اور بنانے والا کوئی اور نہیں ہے مگر یہ خود۔ ایمان بالرسول کے بارے میں ان کا یہ دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب رسولوں سے ان لوگوں کو اللہ کا زیادہ علم ہے، بلکہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو صفات سے معطل ماننے اور وحدت الوجود کے مسئلے کا علم انہوں نے براہ راست اللہ سے حاصل کیا ہے اور یہ کہ اللہ سے براہ راست علم حاصل کرنے میں یہ لوگ (معاذ اللہ) رسولوں کے مساوی ہیں۔

رہا یوم آخر پر ایمان، تو اس کے بارے میں یہ اشعار سنئے :

فلم یبق الّا صادق الوعد وحدہٗ

وبالوعید الحق عین تعاین

وان دخلوا دار الشقاء فانھم

علیٰ لذّۃ فیھا نعیم یباین

(یعنی، کوئی بھی باقی نہیں رہے گا، مگر صرف صادق الوعد، اور آنکھ اللہ کی وعید دیکھ لے گی، اور اگر لوگ جہنّم میں داخل کئے گئے تو وہ اس میں بھی لذّت اور لطف پائیں گے)

پھر یہ شخص (یعنی ابنِ عربی) بعض پہلے کے اہلِ ضلال سے نقل کرتا ہے کہ

جو لوگ دوزخ میں داخل کئے جائیں گے، ان کے لیے جہنم کی آگ طبیعتِ ثانیہ بن جائے گی، جس سے وہ لوگ لطف اندوز ہوں گے، لہٰذا نہ دوزخ سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت ہے، نہ پریشان ہونے کی اور نہ عذاب کوئی چیز ہے، کیونکہ وہ امرِ مستعذب (لذیذ) ہے"۔[1]

جب انسان کا کوئی انفرادی وجود ہی نہیں، تو پھر حق و باطل، خیر و شر اور معروف و منکر کے درمیان امتیاز اور ایک کا انتخاب و اختیار اور دوسرے سے اجتناب بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ نیز بعثتِ انبیاء کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ کسی فریضۂ اخلاق و عمل کی ادائیگی انسان کے لیے ضروری نہیں رہتی۔ وہ ہر بندِ شریعت سے آزاد ہو جاتا ہے اور عصیان و کفر کی راہوں پر گامزن ہونے کے لیے اُسے کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ اب وہ جس کھیت کو چاہے روندے اور جس چراگاہ میں چاہے منہ مارے۔ حرام و حلال دونوں اس کی نظر میں یکساں ہوتے ہیں۔ وہ کسی شے کا مکلّف نہیں رہتا۔ یہ وحدت الوجود کے نظریئے کا بدیہی نتیجہ ہے۔ چنانچہ ابنِ عربی کے مندرجہ ذیل اشعار ان کے اسی اعتقاد کی نشاندہی کرتے ہیں:

الربُّ حق و العبد حقٌ
یا لیت شعر من المکلّف
ان قلت عبد فذاك رب
او قلت رب انی یکلّف

"یعنی رب بھی خدا ہے اور بندہ بھی خدا ہے، پھر مکلّف کون رہا؟ کوئی بھی نہیں، اگر تم کہتے ہو "عبد" تو وہی "ربّ" بھی ہے، جسے تم رب کہتے ہو وہ مکلّف کیسے ہو جائے گا"۔

وحدت الوجود کا نظریہ انسان کو اعتقادی گمراہی ہی میں مبتلا نہیں کرتا بلکہ اپنے

---

[1] بحوالہ حیات امام ابنِ تیمیہؒ ترجمہ رئیس احمد جعفری ص ۵۱۹ - ۵۲۰ -

ماننے والے کے اندازِ فکر و عمل پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ ہمہ اوست کے قائل ذہنی اور جذباتی طور پر سکون کی طرف مائل ہوتے ہیں جو رفتہ رفتہ جمود کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ عملاً وہ رہبانیت پسند ہوتے ہیں۔ زندگی کی کشمکش سے گریزاں اور ننگ وجود سے عاری۔ گوشۂ تنہائی میں تخیل کی دنیا بسا لینے ہی کو مقصودِ حیات سمجھتے ہیں۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ اجتماعی زندگی پر نیکی حکمران ہو یا بدی۔ اسلام کا غلبہ ہو یا کفر کا۔ یہ ہر کفر کے ساتھ سازگاری پیدا کر لیتے ہیں۔ اس کے لیے جواز فراہم کرتے ہیں، حق کی حمایت اور اس کے دفاع کی قوت نہ ان کے اندر باقی رہتی ہے اور نہ وہ اسے ضروری سمجھتے ہیں۔ حق مظلوم ہو تو ہوا کرے، ان کے نزدیک کمالِ حق شناسی یہ ہے کہ انسان کا قلب اور ذہن حق و باطل اور کفر و اسلام کے بکھیڑوں میں نہ اُلجھے۔ ان کے خیال میں فوزِ عظیم یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کو ذاتِ خداوندی میں اس طرح گم کر دے کہ "انا الحق" بن جائے۔ وہ انا الحق کہہ کر سر کٹا دینا تو آسان سمجھتے ہیں، مگر حق کی راہ میں کانٹے کی ایک خلش بھی گوارا نہیں کرتے۔ جب سے وحدت الوجود کا نظریہ وجود میں آیا ہے، اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت میں شاذ و نادر ہی کوئی ورق ایسا نظر آئے گا جو اس نظریئے کے ماننے والوں نے اپنے خون سے لکھا ہو۔

۲۔ ابوالفضل

مُلّا مبارک ناگوری کا بیٹا۔ فیضی کا چھوٹا بھائی۔ نہایت ذہین و فطین تھا۔ پندرہ برس کی عمر میں تمام علوم و فنون حاصل کر لیے تھے۔ سترہ سال کا تھا جب اس نے آیۃ الکرسی کی تفسیر لکھی اور اکبر کو پیش کی۔ فیضی اس وقت دربار سے منسلک ہو چکا تھا اور اس کے ذریعے ابوالفضل کی لیاقت و ذہانت کی خبر اکبر تک پہنچ چکی تھی۔ اکبر نے اسے ملازمت شاہی میں داخل کر لیا۔ اُس وقت اکبر کو تختِ نشین ہوئے نواں سال جا رہا تھا۔ بہت جلد چار ہزاری

منصب سے سرفراز کیا گیا، آخر کار وزارتِ عظمٰی کے منصب پر پہنچا۔ ابوالفضل ایک کامیاب سیاستدان، مدبر اور زیرک و دانا سپہ سالار تھا۔ اکبر کا معتمد مشیر کار، دینِ الٰہی کا خلیفہ اور ترجمان تھا۔ اکبر اسے نہایت عزیز رکھتا تھا۔ ابوالفضل شروع ہی سے آزاد خیال تھا۔ یہ آزاد خیالی بڑھتے بڑھتے آوارگیٔ خیال اور الحاد تک پہنچی۔ مخدوم الملک، صدر الصدور اور دوسرے درباری علمائے نے اپنی پستیٔ کردار، علمی بے مائیگی اور فروعی اختلافات میں تشدد سے اکبر کو اسلام سے برگشتہ کیا تھا۔ شیخ مبارک اور اس کے بیٹوں نے اسے آزادہ روی کا خوگر بنایا اور اس کے ملحدانہ افکار کو غذا فراہم کی۔

شیخ محمد اکرام جنہوں نے اپنے سلسلۂ کوثر[1] میں ہر فتنے کی تاویل اور ہر کج رو کی وکالت کی ہے، ابوالفضل کے متعلق ان کی رائے یہ ہے کہ وہ ایک مخلص مسلمان تھا، بس ذرا آزاد خیال تھا، وہ ملحد نہیں تھا اور نہ ہی اکبر کے الحاد میں ان باپ بیٹوں کا کوئی حصہ تھا چھوٹی تزک کے متعلق، جس میں جہانگیر نے لکھا ہے کہ شیخ ابوالفضل نے میرے باپ اکبر کے دل میں یہ بات بٹھادی تھی کہ قرآن مجید رسولِ اکرمؐ کا اپنا کلام ہے، ان کا ارشاد ہے کہ اُسے اب عام طور پر مشتبہ سمجھا جاتا ہے۔ مزید برآں ابوالفضل کے بارے میں جہانگیر معتبر راوی نہیں، اگر وہ کلام مجید کا منکر ہوتا تو بدایونی ضرور اس کا ذکر کرتا۔

جہاں تک چھوٹی تزک کے مشتبہ ہونے کا تعلق ہے، یہاں اس سوال پر بحث کا موقعہ نہیں ہے، مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ شیخ اکرام صاحب ابوالفضل کی دینداری کے ثبوت میں جن رقعات سے استشہاد کرتے ہیں، ان کے متعلق خود ان کا اپنا ارشاد ہے کہ ان رقعات کی صحت پر حال میں شبہات ظاہر کئے گئے ہیں۔ رہا یہ ارشاد کہ بدایونی نے چونکہ اس بات کا ذکر نہیں کیا اس لیے یہ روایت اگر صحیح ہو تب بھی اس کو اہمیت نہیں دی جاسکتی، تو بے شک بدایونی نے جہانگیر کے بیان کردہ الزام کا ذکر مِن وعَن انہی الفاظ میں نہیں کیا، لیکن ابوالفضل

---

[1] آبِ کوثر، رودِ کوثر اور موجِ کوثر

نے اکبر کی گمراہی میں جس طرح حصّہ لیا اس کا تذکرہ بدایونی کی تاریخ میں متعدد مقامات پر ملتا ہے۔ ایک جگہ تو وہ اکبر کے ملحدانہ افکار اور دین سے انحراف کی ذمّہ داری صاف اور واضح الفاظ میں ابوالفضل پر ڈالتے ہیں۔ ملّا محمد یزدی کا، جس نے اکبر کو اصحابِ ثلاثہ سے برگشتہ کیا تھا، ذکر کرتے ہوئے بدایونی لکھتے ہیں :

"حرام زادہ بیر بر، شیخ ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح تو اس "یزیدی" سے بھی بازی لے گئے، انہوں نے بادشاہ کو سرے سے دین ہی سے منحرف کر دیا اور وحی، نبوت، معجزہ، کرامت اور شریعت کے مطلق انکار پر لے آئے"۔

شیخ اکرام نے ابوالفضل کی دینداری کے ثبوت میں انشائے ابوالفضل اور اس کی دوسری تصانیف پیش کی ہیں۔ بلاشبہ اس آئینے میں ابوالفضل کی وہی شکل نظر آتی ہے جو انہوں نے دکھانا چاہی ہے، مگر ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ کسی شخص کی تصانیف اس کے حقیقی عقائد کی آئینہ دار ہوں۔ اس کے لیے ہمیں اس کی عملی زندگی کو بھی دیکھنا ہوگا۔ اس کی عملی زندگی اس کی تصانیف میں بیان کردہ افکار و عقائد کے مطابق ہوگی تب اس شخص کی صفائی پیش کرتے وقت ان تصانیف سے استشہاد کیا جائے گا ورنہ نہیں اور کسی شخص کی عملی زندگی کے لیے اس کی تصانیف کی طرف نہیں ــــــ ، ہم عصر تاریخوں اور تذکروں کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ تنہا ابوالفضل کی تحریر پر تو کسی صورت بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے جو واقعات کو من و عن پیش کر دیا کرتے ہیں، حقائق کو نہ چھپاتے ہیں اور نہ انہیں مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، خواہ ان حقائق کی زد خود انہی پر کیوں نہ پڑتی ہو۔ اس کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ شیخ مبارک نے اگرچہ محضر نامہ خود تیار کیا تھا اور اس پر انہوں نے اپنے دستخط بھی ثبت کئے تھے، مگر ابوالفضل اس سارے قصّے کو گول کر جاتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل خود ابوالفضل کے قصیدہ خواں شیخ محمد اکرام کی زبان سے سنئے۔ رودِ کوثر میں ارشاد ہوتا ہے :

"یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ابوالفضل جس نے محضر کے متعلق اکبر نامہ میں ایک طویل اندراج دیا ہے، اپنے والد شیخ مبارک کا بالکل ذکر نہیں کرتا۔ بلکہ محضر پر دستخط کرنے والے جن علماء کے اس نے نام لکھے ہیں، ان میں شیخ مبارک کا نام نہیں دیا گیا۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہ تھی کہ محضرِ اجتہاد پر جس طرح عمل کیا گیا اُسے دیکھتے ہوئے ابوالفضل اس سے اپنے والد کا انتساب نہ چاہتا تھا۔ طبقاتِ اکبری کے مطابق بھی شیخ مبارک دستخط کنندگان میں سے تھے۔"

گویا ابوالفضل نے ایک اہم ترین حقیقت پر اس لیے پردہ ڈال دیا کہ اس سے اس کے والدِ بزرگوار کا حقیقی کردار دنیا کے سامنے آتا تھا۔ تاریخ کے ساتھ خیانت کرنے والے ایسے شخص نے اگر اپنے خطوط و رقعات میں اپنے حقیقی خدوخال اور عقائد و افکار پر پردہ ڈال کر اپنے آپ کو ایک نیک نفس اور متدین شخص کی حیثیت سے پیش کیا ہو تو کیا تعجب ہے۔ خصوصاً جب کہ اسے یہ احساس ہو کہ اس کا کردار جس نوعیت کا ہے، اس کا ذکر تاریخ میں اچھے الفاظ سے نہیں ہو گا۔ جیسا کہ شیخ مبارک کے واقعہ سے پتہ چلتا ہے۔

ابوالفضل کی عملی زندگی کا منجار کیا تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اکبر نے اُسے اپنا خلیفہ اور اپنے دینِ الٰہی کا ترجمان بنایا تھا۔ دربار میں مسلمان امراء کا جو گروہ اکبر کے ملحدانہ افکار و اعمال سے سخت نالاں تھا، اکبر کے آخری ایّام میں اس کا ابوالفضل کے ساتھ جو سلوک رہا۔ اُس سے بھی یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اس گروہ کے نزدیک اکبر کی بے دینی کا ذمّہ دار ابوالفضل ہی تھا۔ زیادہ مناسب ہو گا اگر یہ داستان رودِ کوثر کے مصنّف کی زبان سے سنی جائے۔

"اکبر کے مذہبی مشیروں میں ابھی ابوالفضل باقی تھا۔ جس طریقے سے اسے بادشاہ کی حضوری سے دکن میں لے جایا گیا اور وہاں اس سے جو سلوک ہوا اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس میں دربار کی ایک با اثر پارٹی کی سازش کو دخل تھا۔

سنہ ۱۶۰۱ء میں ابوالفضل بادشاہ کے ساتھ اسیر گڑھ کے محاصرے میں شریک تھا۔ جب اکبر اسیر گڑھ کی فتح کے بعد شمال کو مڑا تو خانخاناں نے جو اکبر کی طرف سے دکن کی فتح پر مامور تھا، بادشاہ سے درخواست کی کہ ابوالفضل کو میری مدد کے لیے یہاں چھوڑ جائیے، آدمی سمجھ دار اور معاملہ فہم ہے، اس مہم میں بڑا کام آئے گا، چنانچہ بادشاہ نے ابوالفضل کو خانخاناں کے حوالے کیا اور خود آگرے روانہ ہوا۔ بادشاہ کی واپسی کے بعد خانخاناں نے شیخ کو اس قدر دق کیا کہ شیخ کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ ایک تو صورتِ حالات ہی ایسی تھی کہ شیخ کو ناگوار گذرتی ہوگی۔ دربار میں وہ بادشاہ کی ناک کا بال تھے۔ کوئی امراان کے مشورے کے بغیر ملنے نہ پاتا۔ یہاں معاملہ دگرگوں تھا۔

خانخاناں سپہ سالار اور شیخ اس کے ماتحت! اور پھر خانخاناں نے بھی اسے دق کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ شیخ کے خط اس درد و اندوہ سے بھرے ہوئے ہیں جو انہیں دکن کے سفر میں اٹھانے پڑے۔ ایک خط میں بادشاہ کی نسبت لکھتے ہیں:

"بخدمتِ دکن حسب الحکم ایشاں آمدم۔ اما چہ محنت ہائے کہ نکشیدم و چہ درشتیہائے کہ ندیدم۔ قبلۂ من عساکر ہجراں غلبہ نمودہ است و ہجوم علی العموم فرمودہ و من بیکس بے یراق و سلاح در میدانِ ہموم و معرکۂ غموم فرو ماندہ۔ نہ یارائے گریختن دارم نہ قدرتِ آویختن"

ایک اور خط میں لکھا ہے کہ کاش میں پیدا نہ ہوتا تاکہ دکن کا سفر اور اس کی مصیبتیں نہ اٹھانی پڑتیں ...... "حق علیم اعلام است کہ زندگی برمن گرانی کند پیدا کنندۂ عالم و آدم کاش کہ مرا بوجود نمے آورد تا محنت ہائے دکن دامن گیرِ حیات نے گردید۔" شیخ نے اس طرح کے کئی خط شاہزادوں، شاہزادیوں، بادشاہ

کی ملکہ اور والدہ کے نام لکھے کہ بادشاہ سے کہہ کر مجھے واپس بلا لو۔ ایک خط میں لکھا ہے کہ میں کئی عرضیاں بادشاہ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں لیکن خانخاناں کے جو حامی دربار میں ہیں وہ میری عرضیاں بادشاہ تک پہنچنے نہیں دیتے (جماعۂ کہ اعوان وانصار اویند عریضۂ مرا بنظر اقدس حضرت نمے آوردند) ایک خط میں بالتصریح بخشی الملک شیخ فرید کی نسبت لکھا ہے کہ میں بادشاہ کو سپہ سالار اور سرداروں کے تبادلہ کی نسبت ہزار تاکید سے لکھتا ہوں، لیکن بخشی الملک کی طرف سے کوئی اور ہی مشورہ ملتا ہے ......"

اور یہ "جماعۂ کہ اعوان وانصار اویند" کون تھے؟ ایک تو یہی بخشی الملک شیخ فرید دوسرا خانِ اعظم جو اُن دنوں وکیلِ مطلق اور امیر الامراء تھا اور بادشاہ کی مہر جس کی تحویل میں تھی۔ تیسرا قلیچ خاں جو لاہور کا گورنر تھا۔

اسی زمانے میں شہزادہ سلیم نے باپ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ اکبر نے ابوالفضل کو دکن سے فوراً طلب کیا۔ شہزادہ سلیم کو پتہ چلا تو اس کے اشارے پر بندھیل کھنڈ کے راجہ نرسنگھ دیو نے ابوالفضل کو قتل کر ڈالا (۱۶۰۲ء) ابوالفضل کے قتل کی خبر دربار میں پہنچی، تو اکبر کے گوش گذار کرنے کی ہمت کسی کو نہ ہوتی تھی۔ آخر ابوالفضل کا وکیل سیاہ لباس پہن کر دست بستہ اکبر کے حضور میں پہنچا۔ چغتائی خاندان میں رواج تھا کہ کسی شہزادے کے انتقال کی خبر اس کا وکیل باپ تک اسی طرح پہنچاتا تھا۔ اکبر کے لیے یہ خبر بجلی گرنے سے کم نہ تھی۔ فرطِ غم سے نڈھال سا ہوگیا اور بولا

"اگر شہزادہ را داعیۂ پادشاہی بودے مرا کشتے و شیخ را نگاہ داشتے"۔

(شہزادے کے سر میں بادشاہی کا سودا سمایا تھا تو مجھے مار ڈالتا۔ شیخ سے تعرض نہ کرتا)

پھر یہ شعر پڑھا۔

شیخِ ما از شوقِ بے حد چوں سوئے ما آمدہ
زاشتیاقِ پائے بوسی بے سر و پا آمدہ

ابوالفضل بے مثل شاعر، مؤرّخ اور ادیب وانشاء پرداز تھا۔ آئینِ اکبری کے دیباچے میں انگریز مؤرّخ بلاخ من اس کے انشاء کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

"ابوالفضل کے انشاء پر کسی قسم کی رائے کا اظہار بے سود ہے۔ عبداللہ ازبک شاہ بخارا کہا کرتا تھا کہ وہ اکبر کے تیروں سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا کہ ابوالفضل کے قلم سے ڈرتا ہے۔ ہندوستان میں ہر جگہ اسے ایک زبردست انشاء پرداز تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے مکتوبات تمام مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں..... واقعہ یہ ہے کہ وہ انشاء کا کامل نمونہ ہیں ...... اس کا طرز بے مثل ہے اور اس کی تحریر ہر جگہ پڑھی جاتی ہے، لیکن اس کا اتّباع نہ کیا گیا ہے نہ کیا جا سکتا ہے"۔

ایک ہندو مؤرّخ ایشوری پرشاد لکھتا ہے:

"وہ نثر کا بادشاہ تھا، اس کی تحریر اس قدر سادہ اور سلیس تھی کہ پورے مشرق میں اس کی مثال نہیں ملتی"

اکبر نامہ اور آئینِ اکبری ابوالفضل کی مشہور تصانیف ہیں "مکاتبت علامی" ابوالفضل کی انشاپردازی کا شاہکار مرقع ہیں۔

۴۔ اکبر

جلال الدین اکبر ۱۵ اکتوبر ۱۵۴۳ء کو ریگزار سندھ میں امرکوٹ کے مقام پر پیدا ہوا یہ وہ زمانہ تھا جب ہمایوں شیر شاہ کے ہاتھوں شکست کھا کر مارا مارا پھر رہا تھا۔

برِصغیر میں دوبارہ قدم جمانے کی کوششوں میں ناکام ہوکر ہمایوں قندھار کی طرف بھاگا۔ راستے میں اس کے بھائی مرزا عسکری نے اسے گرفتار کرنا چاہا، وہ خود تو ہاتھ نہ آیا مگر اکبر اس کے قبضے میں آگیا۔ وہ اسے قندھار لے گیا۔ نومبر ۱۵۴۵ء میں ہمایوں نے قندھار عسکری سے چھینا تو باپ نے بیٹے کو دیکھا۔ ۱۵۴۷ء میں اسے حصولِ تعلیم کے لیے استاد کے حوالے کیا گیا۔ ہمایوں اگرچہ ۱۵۴۰ء سے ۱۵۵۵ء تک سلطنتِ گم گشتہ کو واپس لینے کے لیے دن رات جدّ وجہد میں مصروف رہا، تاہم اس نے اکبر کی تعلیم کی طرف پوری توجہ دی۔ جہاں ایک استاد کی غفلت معلوم ہوئی اسے فوراً علیحدہ کرکے دوسرا مقرر کیا گیا اس طرح یکے بعد دیگرے کئی استاد مقرر ہوئے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں کی یہ کوششیں بارور نہ ہوئیں۔ اکبر ان پڑھ ہی رہا۔ کچھ اس وجہ سے کہ ہر استاد نے اپنا طریقۂ تعلیم آزمایا ہوگا اور زیادہ تر اس بنا پر کہ ابتدا میں کمسن اکبر کا رجحان سیر و شکار اور اسی نوعیت کے دوسرے مشاغل کی طرف رہا، تاہم بعض محقّقین کی رائے یہ ہے کہ اکبر اُمّی محض نہ تھا۔ اس کا اشتہار اس کے خوشامدی مؤرخین نے دیا ہے۔ ہمایوں نے جس کی تعلیم کی طرف اتنی توجہ دی ہو وہ اُمّیِ محض کیسے رہ سکتا تھا۔ بہرحال اس بات پر سب متفق ہیں کہ وہ نہایت ذہین تھا، بعد ازاں اس کی اسی ذہانت اور بے علمی یا جہلِ مرکب نے مل کر اسے الحاد کی راہ پر ڈال دیا۔

ع اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

۱۵۵۶ء میں وہ بادشاہ بنا۔ اس نے مغلیہ سلطنت کی حدود وسیع کیں اور اسے استحکام بخشا۔ حکومت کے مختلف شعبوں میں اصلاحات جاری کیں۔ بادشاہ بننے کے بعد اس کا علمی ذوق اُبھرا۔ علماء و فضلاء کی ایک کثیر جماعت اس کے دربار سے وابستہ تھی، جن کے ساتھ اس کی صحبتیں اور مذاکرے رہتے اس کے حکم سے ترکی سنسکرت اور عربی سے بہت سی کتابوں کے تراجم ہوئے اور متعدد تواریخ لکھی گئیں اکبر علوم و فنون کا قدر دان تھا۔ اس کے دربار میں اپنے عہد کے بڑے بڑے شاعر جمع ہو گئے تھے۔

اکبر نے دین و مذہب کے متعلق جو پالیسی اختیار کی اور جس لادینی والحاد کو اپنی سلطنت کی فکری بنیاد بنانا چاہا، اس کے متعلق مؤرخ مختلف رائے رکھتے ہیں۔ اکثر ہندو مؤرخین نے اس پالیسی کو سراہا ہے۔ خصوصاً جب سے برصغیر میں متحدہ قومیت کی تحریک شروع ہوئی ہے، اکبر کو اس تحریک کا پیشرو قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اکبر اپنے مشئومہ عزائم میں کامیاب ہو جاتا تو برصغیر کا نقشہ آج سے بالکل مختلف اور ہندوؤں کی خواہشات اور عزائم کے مطابق ہوتا۔

شیخ محمد اکرام اکبر کے دینِ الٰہی کو نیا دین تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے اکبر نے کسی نئے دین کی بنیاد نہیں رکھی تھی، بلکہ وہ تو محض ایک سلسلہ (CULT) تھا۔ اکرام صاحب بڑے "صلح کل" قسم کے انسان ہیں ان کے نزدیک ایک شخص مسلمان کا سا نام رکھ لینے کے بعد جو نقطۂ نظر چاہے اپنائے اور اس کی تبلیغ کرے اس کے اسلام میں فرق نہیں آتا۔ انھوں نے اپنی تصنیفات آبِ کوثر، رودِ کوثر اور موجِ کوثر میں ہر کج رو کی حمایت اور اس کے افکار و نظریات اور اعمال و اشغال کی تاویل کی ہے۔ حتیٰ کہ ان کا قلم مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے متبعین کی مدح سرائی سے بھی نہیں چوکا۔ ضالّ اور مضلّ تحریکوں کے ساتھ یہ مداہنت ہمارے جدید متفکرین و مبصرین کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ خالص اسلامی تحریکوں میں یہ حضرات طرح طرح کے کیڑے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ بعض تحریکیں تو ان کے تبصروں اور تذکروں میں جگہ پانے کے قابل بھی نہیں ہوتیں اگرچہ ان کے اثرات اپنے عہد پر کتنے ہی گہرے اور دُوررس کیوں نہ ہوں۔

تاہم حقیقت پسند مؤرخین، خواہ وہ دوسرے پہلوؤں سے کتنے ہی متعصب کیوں نہ ہوں، اکبر کی بے دینی والحاد پر مبنی پالیسی کو غلط اور احمقانہ قرار دیتے ہیں۔ سمتھ کہتا ہے —— "دینِ الٰہی اکبر کی عقلمندی کا نہیں حماقت کا آئینہ دار تھا" ایک ہندو مؤرخ ڈاکٹر قانونگو لکھتا ہے:

"اس (اکبر) کے ایک نئے مذہب کا پیغمبر اور رعایا کا دینی و دنیوی سربراہ بننے کے خواب نے اس کے پورے منصوبے (متحدہ قومیت کی تخلیق) کو تباہ کر ڈالا...... اس نے اسلام کے ساتھ ناانصافی کی اور بلاضرورت اس کی تذلیل کی، جس کے لیے تاریخ اسے کبھی معاف نہیں کرے گی"۔

اکبر کی زندگی کے آخری سال نہایت پریشان کن تھے۔ اس نے جس نئے دین کی بنیاد رکھی تھی وہ قبولیت کی حد تک معدودے چند افراد سے آگے نہ بڑھ سکا، مگر اس کے جو اثرات معاشرے اور حکومت پر مترتب ہو رہے تھے، ان سے ہر طرف بے چینی اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔ عام مسلمان ہی اس کے مخالف نہ تھے بلکہ دربار کے اندر مسلمان امراء کا ایک مضبوط گروہ بھی اس کی پالیسی کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اپنی سالہا سال کی سعی و جہد اور عزائم کے اس حشر سے اس کے دل و دماغ سخت متاثر ہوئے تھے۔ رہی سہی کمی شہزادہ سلیم (جہانگیر) کی بغاوت اور اس کے اشارے پر ابوالفضل کے قتل نے پوری کر دی۔ اس کے دوسرے اہم مشیر اور دین نو کے مخلص پیرو پہلے ہی دنیا سے کوچ کر گئے تھے۔ اب وہ اپنے خیالات و افکار کا آپ نمائندہ اور پیرو تھا۔

ابوالفضل کے قتل کے بعد اکبر صرف چند سال زندہ رہ سکا اور اکتوبر ۱۶۰۵ء میں مر گیا۔ ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ مرنے سے پہلے اس نے اپنے کیے پر پشیمانی کا اظہار کیا تھا اور توبہ کر لی تھی، اس طرح اس کا خاتمہ ایمان پر ہوا ۔ اگرچہ تاریخ اور تذکروں میں اس کے متعلق کوئی ثقہ روایت نہیں ملتی، بلکہ اس کے برعکس تاریخیں کہتی ہیں کہ مرنے سے پہلے اکبر کی زبان گنگ ہو گئی تھی؛ تاہم تاریخ کو اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ کوئی شخص اپنے اعمال و افعال سے توبہ کر کے مرا ہے یا بے توبہ کیے مر گیا۔ وہ تو اس سے بحث کرتی ہے کہ اس شخص کے اعمال و افعال کس نوعیت کے تھے اور ان سے ملک اور معاشرے پر کس قسم کے اثرات مرتب ہوئے۔ اکبر نے اگر تائب ہو کر جان دی، تو یہ اس کا اور اللہ تعالیٰ

کا معاملہ ہے۔ اس کے طرزِ عمل اور الحاد و بے دینی سے برِصغیر کے مسلمان معاشرے کو جو نقصان پہنچا وہ اپنی جگہ پر ہے۔ اس کا خمیازہ خود مغل اقتدار کو بھگتنا پڑا۔ اکبر کی اسی غلط بلکہ بقول سمتھ "احمقانہ" روش کے ردِ عمل میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وہ کشمکش شروع ہوگئی جس نے بالآخر مغلیہ حکومت کو انتشار اور زوال کی راہ پر ڈال دیا۔

۴۔ اورنگ زیب عالمگیر

اورنگ زیب عالمگیر شاہجہان کا تیسرا بیٹا تھا۔ ۱۶۱۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کی تعلیم اور تربیت شاہجہان نے بڑے اہتمام سے کی تھی۔ وہ اپنے دوسرے بھائیوں سے زیادہ لائق تھا۔ اس نے شہزادگی کے زمانے میں نہایت اہم مہموں میں سپہ سالاری کے فرائض انجام دیئے اور فنونِ حرب میں اپنی قابلیت کا سکہ جمایا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں دکن میں نائب السلطنت مقرر ہوا اور اپنی اعلیٰ انتظامی صلاحیت کا ثبوت دیا۔ شاہجہان، اورنگ زیب کی ذہنی و عملی برتری تسلیم کرنے کے باوجود اپنے بڑے بیٹے داراشکوہ کی طرف مائل تھا۔ داراشکوہ فکر و عمل کے اعتبار سے اپنے دادا اکبر کا نقشِ ثانی تھا اور بھگتی تحریک سے متاثر تھا۔ اورنگ زیب دینی مزاج اور ذہن رکھتا تھا۔ راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادے خواجہ محمد معصومؒ کا عقیدت مند تھا۔ داراشکوہ کے ہاتھ میں زمامِ سلطنت چلے جانے کے معنی یہ تھے کہ عہدِ اکبری کے شب و روز پھر پلٹ آئیں۔ اورنگ زیب اور داراشکوہ میں جنگوں کا بنیادی سبب یہی تھا۔

شاہجہان ۱۶۵۷ء میں بیمار پڑا تو اس کے بیٹوں میں تخت نشینی کی جنگ چھڑ گئی جس میں آخر کار اورنگ زیب کامیاب رہا۔ اورنگ زیب کا دور نہایت ہنگامہ خیز اور پُر فتن دور تھا۔ اس دور کا ایک بڑا حصہ دکن کی ریاستوں کو سرنگوں کرنے میں گذرا جو گوناگوں پیچیدگیوں کا موجب بنی ہوئی تھیں۔ دکن پر مغلیہ اقتدار تو قائم

ہوگیا، مگر دارالحکومت سے طویل مدت تک مسلسل غیر حاضری کی وجہ سے شمالی ہندوستان میں اقتدار کے خواہاں سرکش گروہ اور امراء سردار سر اٹھانے لگے۔ اورنگ زیب کی زبردست شخصیت کی وجہ سے یہ فتنے وقتی طور پر دب گئے، مگر انتشار و اضطراب کی یہ رو اندر ہی اندر جاری رہی، چنانچہ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی پوری شدت کے ساتھ از سرِ نو سطح پر آگئی۔

اورنگ زیب کا شمار مغلوں کے عظیم ترین حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ نہایت بہادر اور دلیر، صاحبِ تدبیر، مستقل مزاج اور حوصلہ مند تھا۔ مختلف علوم و فنون میں مہارت رکھتا تھا۔ نہایت متدین اور خدا ترس تھا۔ شعر و ادب کا عمدہ ذوق رکھتا تھا۔ جادو ناتھ سرکار اس کی شخصیت اور کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"جسمانی ہمت اور تمکنت کے علاوہ وہ اوائل زندگی ہی سے ایک بادشاہ کے شایانِ شان محنت و مشقت اور خطرات کا سامنا کرنے کا عادی بن چکا تھا۔ اس نے احترامِ ذات، خود شناسی اور ضبطِ نفس سے کام لے کر اپنے آپ کو اس عظیم الشان منصب کے لیے تیار کیا۔ اورنگ زیب بادشاہوں کے لڑکوں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ ایک وسیع النظر اور سلیم الفطرت عالم تھا۔ آخر دم تک کتابوں سے محبت اس کا شیوہ رہا۔ اگر ہم قرآن کریم کے ان متعدد نسخوں سے صرفِ نظر بھی کرلیں، جو اس نے ایک عابد و زاہد کی سی ریاضت و مشقت کے ساتھ، اپنے ہاتھوں سے لکھے، تب بھی یہ حقیقت ناقابلِ فراموش ہے کہ وہ ایک مشغول حکمران ہونے کے باوجود، فرصت و فراغت کے قلیل اوقات فقہی و دینی کتابوں کے پُر شوق مطالعے اور پرانے نادر مخطوطات مثلاً نہایہ، احیاء العلوم اور دیوانِ صائب کی تلاش میں گذارتا۔ اس سلسلے میں اس کی کیفیت کسی کامل عاشق سے کم نہ تھی۔ اس کے کثیر التعداد رقعات ظاہر کرتے ہیں کہ وہ فارسی شاعری اور عربی ادب پر کامل قدرت رکھتا تھا۔ وہ جب بھی کوئی خط لکھتا اسے مناسب اشعار و اقتباسات

سے مزین کرتا۔ وہ عربی اور فارسی کے علاوہ ترکی اور ہندی بے روک ٹوک بول سکتا تھا۔ اسی کی جودتِ طبع اور سرپرستی کی طفیل آج ہمارے پاس ہندوستان میں مسلمانوں کے قانون کا سب سے بڑا خلاصہ فتاوی عالمگیری ہے جو بجا طور پر اسی کے نام سے منسوب ہے، اور جس سے بعد کے ادوار میں، ہندوستان میں اسلامی نظامِ عدل کو آسانی اور وضاحت کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے"۔

ماثرِ عالمگیری کا مؤلف اورنگ زیب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی ان الفاظ میں کرتا ہے:

" حضرت خلد مکان اپنی فطری سعادت کی وجہ سے دینی احکام و شعائر کے سخت پابند تھے۔ قبلۂ عالم حنفی المذہب سُنّی تھے اور اسلامی فرائضِ خمسہ کی پابندی اور ان کے اجراء و نفاذ میں نہایت کوشاں رہتے ــــ حضرت ہمیشہ باوضو رہتے، کلمہ طیبہ اور دیگر اوراد و وظائف ہر وقت زبان پر جاری رہتے ــــ نماز اوّل وقت میں مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کرتے ــــ اور تمام سنن و نوافل بے حد خلوص اور حضورِ قلب کے ساتھ ادا فرماتے ــــ ایامِ بیض کے روزوں کے بے حد پابند تھے اور ہفتے میں دوشنبہ، پنجشنبہ اور جمعہ کو صائم رہتے تھے۔ جمعہ کی نماز بھی مسجد میں تمام مسلمانوں کے ساتھ ادا فرماتے۔ ــــ مقدّس شب ہائے اسلامی بیداری و عبادت میں بسر فرماتے اور انوارِ فیضِ الٰہی سے چراغِ دین و دولت ہو کر اپنی دینی شعاع سے اہلِ علم کو منور فرماتے۔

قبلۂ عالم حق طلبی کے شیدائی تھے۔ حضرت کا معمول تھا کہ دولت خانے کی مسجد میں تمام رات اہل اللہ کے ساتھ سرگرم گفتگو و ذکر رہتے اور خلوت میں کبھی تکیہ و مسند پر جلوس نہ فرماتے۔

حضرت نے کبھی غیر مشروع لباس زیبِ تن نہیں فرمایا اور چاندی سونے کے برتنوں کے استعمال سے ہمیشہ احتراز فرماتے رہے۔

بادشاہِ رعیت نواز نے کبھی ایسا حکم صادر نہیں فرمایا، جو رفاہِ عامہ کے منافی ہو اور کبھی ایسے فعل کے مرتکب نہیں ہوئے جو مخلوقِ خدا کی پریشانی کا باعث ہو۔ زنانِ بازاری اور دیگر فواحش کے شیدائی دارالحکومت سے خارج کر دیئے گئے تھے۔ اور تمام ممالکِ محروسہ میں اس قسم کے احکام جاری تھے۔ احتساب کا محکمہ قائم تھا اور عاملانِ احتساب ہر شخص سے باز پُرس کرتے تھے اور تمام ممالکِ محروسہ میں سلطنت کی وسعت کے باوصف احکامِ شرعی جاری و نافذ تھے"۔

اورنگ زیب نے احکامِ شرعی کے احیاء و ترویج ہی کے لیے فتاویٰ عالمگیری مدوّن کروائی تھی۔ حافظِ قرآن بھی تھا اور اس لحاظ سے تیموری بادشاہوں میں منفرد۔ حفظ بھی اس وقت کیا جب کہ قافلۂ زندگی عمر کی تینتالیسویں منزل میں تھا، مزید یہ کہ صرف ایک سال کے اندر۔ خطِ نسخ اور خطِ نستعلیق دونوں میں یدِطولیٰ رکھتا تھا۔ علوم و فنون کا سرپرست تھا۔ عدل و انصاف میں اپنے بیٹوں تک سے رُو رعایت نہ کرتا۔ ۱۷۰۷ء میں دکن میں فوت ہوا اور خلد آباد (اورنگ آباد) میں مدفون ہوا۔

ب

۵۔ خواجہ باقی باللہؒ

حضرت مجددؒ کے پیر و مرشد ہیں۔ ان اہلِ حق اور صلحاء و مشائخ میں سے ایک ہیں، جن کا مقصد مشیخت کی بساط بچھا کر خراجِ عقیدت حاصل کرنا نہیں ہوتا، بلکہ جو اپنے عہد میں ضلالت و گمراہی کے اٹھتے ہوئے طوفانوں کو روکنے کی سعی و جہد کرتے ہیں۔

کابل میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد قاضی عبدالسلام سے حاصل کی۔ پھر ملّا صادق حلوائی سمرقندی کے آگے زانوئے ادب تہ کیا، جو ان دنوں کابل میں درس و تدریس کیا کرتے تھے۔ ملّا صادق اپنے وطن تشریف لے گئے تو خواجہ صاحب ان کے ساتھ ہو لیے۔

خواجہ ایک روز اپنے مطالعہ میں منہمک تھے کہ ایک مجذوب آیا اور انہیں اس استغراق کے عالم میں دیکھ کر پکارا ؎

در کنز و ہدایہ نتواں دید خدا را
آئینۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

مجذوب کی یہ نصیحت خواجہ کے دل میں جاگزیں ہو گئی۔ کتابی علم تج کر آئینۂ دل کے جلا و تزکیہ کی فکر میں نکل کھڑے ہوئے۔ مدّتوں بلاد و امصارِ اسلامی میں پھرتے رہے مختلف مشائخ سے اکتسابِ فیض کیا، مگر کہیں تسکین نہ ہوئی۔ آخر ہندوستان شیخ قطب العالمؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کچھ مدّت کے بعد انہوں نے بخارا بھیج دیا۔ خواجہؒ بخارا کے شیخ خواجہ محمد درویشؒ کے صاحبزادے اور خلیفہ تھے۔ خواجہ امکنگی نے انہیں نقشبندیہ سلسلے کی تعلیم دی اور ہندوستان جانے کی ہدایت فرمائی۔

خواجہ برِّ صغیر تشریف لے آئے۔ ایک سال تک لاہور میں قیام فرمایا۔ پھر دہلی کے قلعہ میں تشریف لے گئے اور فیروز شاہ کے قلعہ میں مقیم ہوئے۔ جلد ہی آپ مرجعِ خواص و عام

بن گئے۔ ہندوستان آنے کے بعد خواجہ صرف چار پانچ برس زندہ رہے مگر اس قلیل عرصے میں آپ نے دو اہم کام کئے۔ ایک نقشبندی سلسلے کو برِصغیر میں استحکام بخشا۔ دوسرے اکبر کے درباری امرا میں سے صلاح و خیر رکھنے والی طبیعتوں کو متاثر کیا اور انہیں اُس کام کے لیے ابتدائی طور پر تیار کیا جو بعد ازاں انھوں نے برِصغیر میں اکبر کے بڑھتے ہوئے الحاد اور بے دینی کو روکنے کی صورت میں انجام دیا۔ خواجہ صاحب کے اس کام کو ان کے بعد ان کے مرید اور خلیفہ حضرت مجدّد نے مکمل کیا۔ بڑے منکسر المزاج تھے۔ کوئی بیعت کے لیے حاضر ہوتا تو بالعموم گریز فرماتے اور کہتے "بھائی، مجھ فقیر کے پاس کیا رکھا ہے، کسی مردِ کامل کی طرف رجوع کرو"۔

۷۔ شیخ بدر الدین چشتی

شیخ سلیم چشتی کے صاحبزادے تھے۔ مرشد زادہ ہونے کی وجہ سے اکبر ابتدا میں ان کا بڑا احترام کرتا تھا، مگر جب انھوں نے اکبر کے الحاد و بے دینی کے آگے سر جھکانے سے انکار کیا تو اس کے ساتھ ان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ شیخ دربار کی ملازمت کو لات مار کر گوشہ نشین اور عبادت و ریاضت، ذکر و فکر اور تلاوت و تلقین کے شغل میں مصروف ہو گئے۔ بادشاہ کی طرف سے سختی شروع ہوئی تو مکہ معظمہ چلے گئے۔ بدایونی لکھتے ہیں:

"ایک رات بادشاہ نے انہیں عبادت خانے میں طلب کیا۔ شیخ آئے، مگر پہلے کی طرح آداب بجا نہ لائے۔ بادشاہ کو بڑا ناگوار خاطر گذرا۔ اس نے نشست و برخاست کے انداز اور گفتگو سے انہیں سخت اذیت پہنچائی۔ کچھ تو یہ معاملہ تھا، کچھ دیگر اسباب کی بنا پر تین چار سال بعد ہی فرطِ غیرت و حمیّت سے بالکل خاموشی کے ساتھ اجمیر اور وہاں سے گجرات چلے گئے۔ پھر

تنہا ایک کشتی میں بیٹھ کر حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ بیت اللہ میں وہ اکثر وصالی روزے رکھا کرتے تھے اور تپتی دھوپ میں برہنہ پا طواف کیا کرتے تھے ... . جس سے آبلے پڑ گئے تھے؛ چنانچہ تپِ محرقہ میں مبتلا ہو گئے اور عین عیدِ قربان کے دن ۹۹۰ھ میں اللہ کی راہ میں قربان ہو گئے۔

کمال از کعبہ رفتی بر درِ یار
ہزاراں آفریں مردانہ رفتی

اس خاندان کے یہ آخری بزرگ تھے ان پر سلسلۂ رشد و ہدایت منقطع ہو گیا"۔

ج

۷۔ قاضی جلال الدین ملتانی

بڑے متبحر اور حق پرست عالم تھے۔ پہلے ذریعۂ معاش تجارت تھا۔ پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور آگرہ میں کئی برس تک پڑھاتے رہے۔ قاضی یعقوب مانکپوری کی معزولی کے بعد قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ نہایت عادل اور متدیّن قاضی تھے۔ حق گوئی ان کا طغرۂ امتیاز تھا۔ اکبر کی بے دینی اور الحاد پر بڑی بے باکی کے ساتھ تنقید کرتے تھے، مگر ان کا لڑکا ناخلف نکلا۔ اس کی بددیانتی اور ناشائستہ حرکتوں کا خمیازہ قاضی جلال الدین کو بھگتنا پڑا۔ اکبر تو موقع کی تاک میں تھا ہی، اس نے بیٹے کی بددیانتیوں کو باپ کے سر تھوپا اور دکن کی طرف جلاوطن کر دیا۔ دکن میں متعصّب اہلِ تشیّع کا زور تھا۔ قاضی صاحب کٹر سُنّی تھے۔ اکبر کا مقصد تو دکن بھیجنے سے یہ تھا کہ وہ قاضی کو سخت اذیتیں دے کر اور رسوا کر کے ہلاک کر دیں گے، مگر وہاں کچھ اور ہی صورت پیش آئی۔ قاضی صاحب کی حق گوئی اور اکبر کی بے دینی اور الحاد کے خلاف جہادِ لسانی کی خبر وہاں پہنچ چکی تھی۔ ان لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کے ورود کو مسعود جانا۔ مددِ معاش کے سلسلے میں اراضی دی اور نہایت عزّت و تکریم کے ساتھ پیش آئے۔ قاضی جلال الدین ایک عرصے تک وہاں رہے۔ پھر حج پر چلے گئے۔ زیارتِ حرمین کی سعادت حاصل کی اور وہیں اپنی جان جانِ آفرین کے حوالے کر دی۔

۸۔ جہانگیر

سلیم نام تھا، نور الدین جہانگیر لقب۔ ۳۰ راگست ۱۵۶۹ء کو پیدا ہوا۔ اس کی

ماں جے پور کی راجپوت راجکماری تھی۔ تیموری خاندان میں رواج تھا کہ ان کے بچے چار سال چار مہینے چار روز کے ہوتے تو انہیں مکتب میں بٹھایا جاتا۔ اسی روایت کے مطابق جہانگیر کو تعلیم کے لیے ملک الشّعراء فیضی اور مولانا میر کلاں ہروی محدّث کے حوالے کیا گیا، قطب الدین خاں انکہ اور عبدالرحیم خانخاناں اس کے اتالیق مقرر ہوئے۔ چہل حدیث صدر جہاں سے پڑھی۔ ترکی زبان عبدالرحیم خانخاناں سے سیکھی۔ ۱۵۸۶ء میں راجہ بھگوان داس کی بیٹی سے شادی کر دی گئی۔ ۱۶۰۵ء میں باپ کے مرنے پر تخت نشین ہوا۔ جہانگیر دربار کے مسلمان امراء کے تعاون سے برسرِ اقتدار آیا تھا۔ انہوں نے اس سے وعدہ لے لیا تھا کہ دینِ الٰہی کی خرافات کو ختم کر کے اسلامی شریعت کا تحفّظ اور نفاذ کرے گا۔ ۱۰ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو فوت ہوا اور دلکش باغ شاہدرہ (لاہور) میں دفن ہوا۔

جہانگیر گہرا علمی شغف رکھتا تھا۔ اس نے ایک عظیم الشّان کتب خانہ قائم کیا تھا۔ سفر میں بھی کتابوں کی ایک بڑی تعداد اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ فارسی زبان کا بے نظیر انشاپرداز تھا۔ تزکِ جہانگیری اس کے علم اور فارسی زبان پر بے مثال قدرت کا شاہکار ہے۔ وہ مشکل سے مشکل فلسفیانہ اور مذہبی مسائل کو بڑے اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ عبارت کی سادگی، روانی اور شگفتگی میں ذرا فرق آنے نہیں پاتا۔ جس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے ژرف نگاہی اور گہری فکر اور وسیع مطالعے کا ثبوت دیتا ہے۔ منظر کشی کرتا ہے تو اپنے قلبی جذبات و احساسات کو الفاظ میں اس طرح سمو دیتا ہے کہ انسان رنگینیٔ مناظر کے ساتھ ساتھ رنگینیٔ بیان میں گم ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود سادگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ جہانگیر شاعر بھی تھا اور فیضی کا شاگرد۔ اس کی شاعری سلاست اور رنگینیٔ بیان کا دلکش مرقّع ہے۔ ایک غزل بطورِ نمونہ ملاحظہ ہو۔

من چوں کنم کہ تیرِ غمت بر جگر رسد
تا چشمِ نارسیدہ دگر بر دگر رسد

مستانہ می خرامی و مستِ تو عالمے
اسپند می کنم کہ مبادا نظر رسد
در وصلِ دوست مستم و در ہجر بے قرار
داد از چنیں غمے کہ مرا سر بسر رسد
مدہوش گشتہ ام کہ بپویم رہِ وصال
فریاد ازاں زماں کہ مرا ایں خبر رسد
وقتِ نیاز و عجزِ جہانگیر ہر سحر
امید آنکہ شعلۂ نور و اثر رسد

۹۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت

مخدوم جہانیاں جہاں گشت ۷۰۷ھ میں اوچ میں پیدا ہوئے۔ ان کے جدِّ امجد حضرت جلال الدین سرخ بخاری تھے۔ انہی کے نام پر جلال الدین نام رکھا گیا۔ مخدوم جہانیاں کا لقب انہیں اپنے سلسلۂ مشائخ سے ملا۔ "مخدوم جہانیاں" نے مصر، شام، عراق، عرب، بلخ، بخارا اور خراسان کی خوب سیر و سیاحت کی تھی اس لیے جہاں گشت مشہور ہو گئے۔ بچپن ہی سے آثارِ سعادت نمایاں تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اوچ میں حاصل کی۔ تکمیل ملتان میں شیخ رکن الدین ابو الفتح سے کی۔ سلطان محمد تغلق نے شیخ الاسلام مقرر کیا اور چالیس خانقاہوں کا انتظام ان کے سپرد کر دیا، لیکن جلد ہی اس منصب سے سبکدوش ہو گئے اور بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کو نکل کھڑے ہوئے۔ سات سال تک مکہ معظمہ میں اور دو سال تک مدینہ منورہ میں رہے اور وہاں کے اکابر شیوخ اور محدثین سے اکتسابِ علم و فیض کیا۔ باقی تین سال دوسرے بلاد و امصار کی سیاحت میں گزارے۔

مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے دہلی کے سات بادشاہوں کا دورِ حکومت دیکھا۔

وہ علاؤ الدّین خلجی کے عہد میں پیدا ہوئے۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں وفات پائی۔ فیروز شاہ تغلق کے ساتھ آپ کے تعلقات نہایت اچھے تھے۔ حضرت مخدوم جب بھی دہلی جاتے فیروز شاہ ان کی مجلسِ وعظ وارشاد میں حاضر ہوتا اور اکتسابِ فیض کرتا۔ سلسلۂ سہروردیہ میں مخدوم شیخ رکن الدّین ابوالفتح سے بیعت وارادت تھی اور خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ سلسلۂ چشتیہ میں شیخ نصیر الدّین محمود چراغ دہلی سے خرقۂ خلافت حاصل تھا۔

حضرت مخدوم مرجعِ خلائق تھے۔ بادشاہ، امراء واعیانِ سلطنت، علما، عوام اور خواص سب آپ کی صحبت سے فیض اٹھانے کے لیے حاضرِ خدمت ہوتے تھے۔ امراء ووزراء کی مجلس میں وعظ ونصیحت کا اہتمام ہوتا اور علماؑ وفقہا اور مشائخ کے ساتھ شریعت وطریقت کے مسائل پر گفتگو ہوتی۔ برِصغیر ہی نہیں عراق وروم تک کے لوگ حاضرِ خدمت ہوتے تھے۔

حضرت مخدوم متّبعِ شریعت تھے۔ اتباعِ سُنّت کا خاص اہتمام فرماتے تھے۔ سالکانِ طریقت کو اتباعِ سُنّت کی تلقین فرماتے۔ قلندروں کی وضع قطع کو بدعت وضلالت بتاتے۔ فرماتے جو شخص گفتار، کردار اور رفتار میں متّبعِ سُنّت نہیں ہے وہ ولی نہیں ہے۔ طریقت و شریعت میں تفریق نہ کرتے۔ شریعت کی پابندی کے بغیر طریقت کو بے حقیقت قرار دیتے تھے۔

حضرت مخدوم کی تبلیغی مساعی سے اوچ سندھ اور گجرات کے اطراف میں اہلِ ہنود بکثرت مسلمان ہوئے۔ حضرت مخدوم نے درس وتدریس کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا جس میں دور دراز کے طالب علم آکر شریک ہوتے تھے۔ خود حضرتِ مخدوم قرآن وحدیث اور تصوّف کا درس بالالتزام دیتے تھے۔

۸۷ سال کی عمر میں ۱۰ ذی الحجہ ۷۸۵ھ عیدِ قربان کے دن اوچ میں انتقال کیا۔ تاریخ وفات ہے:

تاریک گشت جملہ جہاں بے جمالِ شاہ
تاریخ بود ہفت صد ہشتاد و پنج سال

ح

۱۰- حسام الدّین احمد مرزا

قاضی نظام الدّین بدخشی کے صاحبزادے تھے۔ قاضی موصوف اکبر کے درباری تھے۔ غازی خان کا خطاب ملا تھا۔ بدایونی کہتے ہیں کہ: "سجدۂ زمین بوس" انہی نے ایجاد کیا تھا۔ مرزا حسام الدّین شیخ مبارک کے داماد اور ابوالفضل اور فیضی کے بہنوئی تھے۔ باپ کی وفات پر موروثی منصب ملا، مگر پھر دنیا داری چھوڑ کر دین کے ہو رہے۔ خواجہ باقی باللہؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان کے اقربا کو ان کا یہ حال گوارا نہ تھا، انہوں نے ان پر سختیاں بھی کیں، مگر یہ ترشی سے اترنے والا نشہ نہ تھا۔ حضرت مجددؒ اپنے ایک مکتوب میں ان کا ذکر "معارف آگاہ" کے الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کی بی بی نے بھی شوہر کی رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ بڑی نیک خاتون تھیں۔ اپنے بھائیوں اور خویش و اقارب سے منہ موڑ لیا اور جو کچھ زر و زیور تھا فقراء میں تقسیم کر دیا۔ ۱۰۴۳ھ میں فوت ہوئے۔

خ

۱۱- خانِ اعظم

نام عزیز مرزا محمدؐ ہے۔ اکبر کا کوکہ (رضاعی بھائی) تھا۔ اکبر اسے دوسرے تمام رضاعی بھائیوں سے زیادہ عزیز اور قابلِ احترام گردانتا تھا۔ مختلف سیاسی و جنگی کارنامے انجام دیئے۔ جن کے صلے میں پنج ہزاری منصب اور خان اعظم کا خطاب عطا ہوا۔ اکبر کی حرکات اور پالیسیوں سے اسے سخت اختلاف رہتا، مگر جہاں ایسے اختلافات دوسرے امرائ پر عتاب کا باعث بن جاتے تھے اکبر اس سے درگذر کرتا اور کہتا کہ میرے اور عزیز کے درمیان جوئے شیر حائل ہے۔ شاہی تقرب اور دنیوی وجاہت کی بنا پر دربار کے اکثر امراء اس سے خار کھاتے تھے۔ اس کی حق گوئی اور حق پسندی کو گستاخی قرار دیتے۔ اقبال نامہ کا مصنّف معتمد خاں بخشی لکھتا ہے:

"خان اعظم بے نظیر مصاحب تھا، لیکن خباثت و نفاق میں سرآمدِ زمانہ تھا۔ درشت گفتار، کج کردار اور بدطینت تھا۔"

بایں ہمہ اس کے علم و ہنر سے یہ کٹر مخالف اور حاسد بھی متاثر تھے۔ معتمد خاں بخشی ہی لکھتا ہے:

"یہ تو اس کے عادات و خصائل تھے، کمالات یہ تھے کہ وہ ایک بے نظیر اور عدیم المثال مصاحب تھا۔ مدعا نویسی، مسلسل گوئی اور تاریخ دانی میں یکتائے زمانہ تھا۔ نستعلیق بہت اچھی لکھتا تھا۔"

ملّا بدایونی لکھتے ہیں:

"نہایت با اخلاق، نیک اور گوناگوں فضائل و ہنر سے متّصف ہے۔ اس کا سا

فہم عالی اور ادراکِ بلند کسی دوسرے امیر میں نہیں پایا جاتا۔"
تزکِ جہانگیری میں جہانگیر لکھتا ہے :

"علمِ سیرت اور فنِ تاریخ میں مکمل استحضار حاصل تھا۔ تاریخ اور تقریر میں بے نظیر تھا۔ مدّعا نویسی میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔ لطیفہ گو بھی بے مثال تھا اور اچھے شعر کہا کرتا تھا۔"

طبقاتِ اکبری جلد دوم میں ہے :

"جودتِ فہم، جدّتِ طبع اور علمِ تاریخ سے واقفیت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔"

اقبال نامے کا مصنّف خانِ اعظم کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے :

"مشارٌ الیہ فہم و ذکا، سلاست بیانی، چرب بیانی اور تاریخ دانی میں یکتائے زمانہ تھا۔ بڑا مستقل مزاج تھا۔ خطِ نستعلیق بہت خوب لکھتا تھا۔ مُلّا میر علی کے بیٹے مُلّا باقر کا شاگرد ہے۔ سبھی اربابِ استعداد اس بات پر متّفق ہیں کہ اس کا خط مشہور اساتذہ کے خط سے کسی طرح کم نہ تھا۔ مدّعا نویسی میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا لیکن عربی نہیں جانتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا عربی میں میری مثال ایک غریب دیہاتی کی سی ہے۔"

خانِ اعظم انسانی نفسیات سے بھی واقف تھا۔ صاحبِ اقبال نامہ لکھتا ہے :

"وہ کہا کرتا تھا ایک شخص نے ایک بات کہی میں نے اس کو سچ سمجھا۔ اس نے اس بات میں مبالغہ آرائی سے کام لیا تو مجھے شک ہوا اور جب اس نے قسم کھائی تو میں سمجھ گیا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔"

خانِ اعظم حق گو اور بے باک بھی تھا۔ اس نے اکبر کو الحاد کی راہ پر جانے سے روکنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ اسے اکثر سمجھاتا اور بسا اوقات شدید لب و لہجے میں خوشامدی امرائے گستاخی اور یاوہ گوئی گردانتے، مگر اسے کچھ پروا نہ تھی۔ ابوالفضل اور بیربر سے

تو بڑے زوردار معرکے رہتے تھے۔ اقبال نامہ سے ظاہر ہوتا ہے اس نے خود ہی نہیں دوسرے امراء کو بھی ترغیب دی کہ وہ بادشاہ کو سمجھائیں۔ شاید اسی سلسلے میں اس نے ایک خط حاکمِ خاندیس راجہ علی خاں کے نام لکھا تھا جو جہانگیر کے زمانے میں پکڑا گیا۔ اس داستان کو اقبال نامہ کا مصنّف معتمد خاں بخشی ہی کی زبان سے سنئے۔ سالِ اوّل جلوسِ جہانگیری کے عنوان کے تحت لکھتا ہے:

"اس سال کے عجیب واقعات میں خانِ اعظم میرزا عزیز کوکہ کی مراسلت کا انکشاف ہے جو اس نے راجہ علی خاں حاکمِ خاندیس سے کی تھی جس میں حضرت عرش آشیانی کی غیبت و بدگوئی کی گئی تھی .... اور بدطینتی اور یاوہ گوئی میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا تھا۔ جو کچھ زبانِ قلم پر آیا کسی مروّت اور لحاظ کے بغیر روئے کاغذ بلکہ روئے دل سیاہ کر ڈالا۔ حضرت قبلہ گاہی کو اتہام پردازی کر کے ایسے عیوب سے منتسب کیا جن کو حضرت کے کتّوں سے بھی منسوب کرنا کمینگی اور سگ نفسی ہے یہ خط قلعہ اسیر فتح ہونے کے بعد راجہ علی خان کے اسباب و اموال میں نکلا اور خواجہ ابوالحسن کے ہاتھ لگا۔ خواجہ نے کئی سال اپنے پاس رکھا۔ آخر ضبط نہ کر سکا۔ اس (خان اعظم) کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے۔ اس نے وہ خط شاہنشاہ کے حضور پیش کر دیا۔ بادشاہ نے بھرے دربار میں خانِ اعظم کو طلب کیا اور اسے خط دے کر کہا اس کو پڑھو۔ اس بے حیا نے بلا تامل پڑھ کر سنا دیا۔ حاضرینِ دربار سب لعن طعن کرنے لگے۔ ہر چند وہ سخت ترین سزا کا مستحق تھا، مگر حضرتِ عرش آشیانی کی نسبتِ لطف و عنایت اس کے آڑے آئی، البتّہ اس کی جاگیر ضبط کر لی گئی اور چند دن نگاہِ التفات سے محروم کر کے نظر بند رکھا"

اکبر جب افہام و تفہیم کے باوجود الحاد کی راہ پر گامزن رہا اور دربار کا رنگ بگڑتا

گیا تو خانِ اعظم ترکِ وطن کر کے حجاز چلا گیا۔ بدایونی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"اکبر کا یہ قاعدہ تھا کہ امرائے سرحد ہمیشہ وقتاً فوقتاً دربار میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ اس سال خانِ اعظم کی طلبی کا فرمان صادر کیا گیا، وہ گذشتہ چھ برس سے دربار میں حاضر نہیں ہوا تھا......... آخری مرتبہ جب خانِ اعظم بنگالہ سے آکر باریاب ہوا، تو اس نے دینی معاملات میں اکبر سے بڑا بحث مباحثہ کیا ــ اکبر کے سامنے ابوالفضل اور بیربر سے تند و تیز گفتگو کی؛ چنانچہ وہ حاضری میں متامّل تھا۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ جام کی جنگ میں اس نے اپنی منّت کے مطابق داڑھی رکھ لی تھی۔ اکبر نے اس کے نام جو فرمان جاری کیا، اُس میں طنزاً یہ بھی لکھا کہ "تیری داڑھی اتنی بھاری ہے کہ تجھے آنے نہیں دیتی"۔ اس کے جواب میں خانِ اعظم نے ایک طویل اور نہایت سخت عریضہ ارسال کیا ــ یہ جواب بادشاہ کے دل میں پھانس کی طرح کھٹک رہا تھا۔ منافقوں نے بھی اس کے خلاف بادشاہ کے خوب کان بھرے۔ دربار کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر خانِ اعظم اہل و عیال اور تمام مال و دولت لے کر جوناگڑھ سے بندر دیو اور وہاں سے حجاز چلا گیا"۔

مکّہ معظمہ پہنچ کر اس نے جو خط اکبر کو لکھا اس کا ذکر پہلے حصّے میں ہو چکا ہے، مگر وہاں خانِ اعظم زیادہ مدّت نہ ٹِک سکا ــ بدایونی رقمطراز ہیں کہ:

"وہاں کے اُمراء کے ہاتھوں تنگ آکر خانِ اعظم ہندوستان واپس آگیا"۔

ممکن ہے اسے ہندوستان کی حکومت کے اشارے پر تنگ کیا گیا ہو، اگرچہ اس باب میں کوئی قطعی شہادت پیش نہیں کی جاسکتی؛ تاہم دونوں ملکوں کے حکمرانوں کے درمیان خاصے گہرے روابط تھے اور تحفہ تحائف کا تبادلہ اکثر ہوتا رہتا تھا، اس لیے ایسا امکان بعید از حقیقت بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ واپس پہنچتے ہی خانِ اعظم نے اکبر کے آگے سپر ڈال دی۔ بدایونی لکھتے ہیں:

"اب اس نے اپنی شانِ بے نیازی اور ساری صفاتِ حمیدہ کو خیرباد کہہ دیا۔ مریدانِ

شاہی میں داخل ہوگیا۔ تسلیمات اور مقررّہ لوازمات بجالایا۔ حضورِ شاہ میں سجدہ تک گذارا۔ اس تغیر کے بعد سرکار دربار میں اس کا چراغ جلنے لگا۔ اب وہ محفلوں، بحث مباحثوں اور بات چیت میں ہر جگہ پیش پیش ہوتا — بادشاہ نے اُسے غازی پور اور حاجی پور کا صوبہ جاگیر میں عنایت کیا۔ اب وہ ابوالفضل کے آگے زانوئے ادب تہ کرکے نئے مذہب کے احکام سیکھنے لگا"۔

لیکن یہ "شاہی مریدی" محض مصلحت پر مبنی تھی۔ خانِ اعظم کو اپنی اس پستی کا خود بھی احساس تھا۔ جہانگیر نے تزکِ جہانگیری میں خانِ اعظم کی ایک رباعی کا ذکر کیا ہے۔ یہ رباعی اس کے اس احساس کی مکمل ترجمانی کرتی ہے۔ شاید یہ اسی دور میں کہی گئی تھی۔

عشق آمد از جنوں برد مندم کرد
وارستہ زصحبتِ خرد مندم کرد
آزاد زبندِ دین و دانش گشتم
تا سلسلۂ زلف کسے بندم کرد

تاہم حضرت خواجہ باقی باللہؒ کا یہ بدستور ارادت مند رہا۔ حضرت مجددؒ کے مکاتیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ترویج شریعت کے سلسلے میں جن امرائے دربار کے ساتھ سب سے زیادہ توقعات وابستہ کر رکھی تھیں، خانِ اعظم ان میں سے ایک تھا۔ خانِ اعظم اکبر کے آخری ایام میں وکیلِ مطلق اور امیرالامراء تھا۔ بادشاہ کی مہر اس کی تحویل میں تھی۔ مصلحت پر مبنی "شاہی مریدی" کے باوجود اس کا دینی احساس زندہ تھا، جب ۱۶۰۲ء میں اکبر نے عیسائی مشنریوں کو مراعات دینے کا فرمان جاری کرنا چاہا تو جن امراء نے اس کی مخالفت کی۔ ان میں خانِ اعظم پیش پیش تھا۔

خانِ اعظم کی شعر گوئی کا ذکر تقریباً ہر صاحبِ ذوق تذکرہ نگار نے کیا ہے۔ خاصے اچھے شعر کہتا تھا۔ نمونہ کلام :-

چوں شد حاصل مرا کام دل از ناموس وننگ
بعد ازیں خواہم زدن بر شیشۂ ناموس سنگ

ایک غزل کا مطلع ہے :

اے زلفِ چلیپائی تو زنجیرِ دلِ من
وی عشق تو آمیختہ با آب وگلِ من

•

نیست کاروبارِ عالم را مدار —— دل نہ کاروبارِ او افسردہ بہ

ایک اَور غزل کا مطلع ہے :

گشت بیمار دل از درد وغمِ تنہائی
اے طبیبِ دلِ بیمار چہ می فرمائی
جانِ غم فرسودِ من شد خاک در راہِ وفا
بیوفا یارا طریقِ خاکساری را ببیں

۱۲ - خان جہان لودی

پیر خاں نام تھا - دولت خاں لودی کا دوسرا بیٹا تھا - پہلے شہزادہ دانیال کے وابستگانِ دامن میں شامل تھا - اس کی وفات کے بعد جہانگیر کے دامن سے وابستہ ہوگیا - جہانگیر تخت پر بیٹھا تو اسے سہ ہزاری منصب اور صلابت خاں کا خطاب عطا ہوا - بعد ازاں اعلیٰ خدمات کے صلے میں پنج ہزاری منصب اور خان جہان کے خطاب سے سرفراز ہوا جہانگیر کے ساتھ اس کے تعلقات دوستانہ تھے - اس کے مزاج میں اسے بڑا درخور حاصل تھا اور وہ اس کا مصاحبِ خاص تھا - نہایت متدیّن اور حق پرست تھا - شیخ فضل اللہ برہان پوری کا ارادت مند تھا - اس کی راتیں بالعموم علمائ اور صوفیا کی صحبت میں گذرتیں - متبّعِ کتاب وسُنّت تھا - اس کی مجالس بدعات سے بالکل پاک ہوتیں -

س

۱۳- امام رازیؒ

امام رازی کا نام محمدؒ، ابوعبداللہ کنیت، فخرالدینؒ لقب۔ نسباً فاروقی ہیں۔ امام صاحب کے والد ابوالقاسم ضیاءالدین عمر اپنے زمانے کے بہت بڑے واعظ، متکلمؒ، صوفی، محدّث، ادیب اور انشاءپرداز تھے۔ علمِ کلام پر انہوں نے ایک بلند پایہ کتاب لکھی۔ علاوہ بریں فنِ اصول و وعظ میں بھی ان کی کتابیں ہیں۔ نہایت فصیح البیان خطیب تھے۔ وعظ و تذکیر اور درس و تدریس ان کا مشغلہ تھا۔ امام صاحب رے میں ۲۵ رمضان ۵۴۳ھ میں پیدا ہوئے۔ بعض ۵۴۲ھ کہتے ہیں۔ جب تک والد زندہ رہے فقہ اور کلام میں ان سے تعلیم حاصل کی۔ ان کے بعد علمِ فقہ میں کمال سمنانی کے آگے زانوئے تلمّذ تہ کیا۔ علمِ کلام و حکمت میں مجید جیلی ان کے استاد تھے۔ تحصیلِ علم کے بعد امام صاحب ایک مدّت تک سیر و سیاحت میں مصروف رہے۔ خوارزم اور ماوراءالنّہر کے علاوہ برِصغیر ہند کا سفر بھی کیا۔

امام صاحب کا ابتدائی زمانہ بڑی مفلسی اور تنگدستی میں گذرا، مگر پھر اللہ نے دولت و تونگری اور جاہ و عزّت سے نوازا، اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اپنے علاقے کے رئیس ہوگئے۔ لسان المیزان میں ہے کہ پچاس غلام زرّیں کمربند باندھے اور منقّش کپڑے پہنے ان کے گرد کھڑے رہتے تھے۔ سلاطینِ غور، سلطان غیاث الدین اور سلطان شہاب الدین کے ساتھ امام صاحب کے تعلقات بڑے گہرے تھے اور وہ بھی ان کے بہت قدردان تھے۔ خوارزم شاہی فرمانروا بھی ان کے عقیدت مند اور علم و فضل کے قدرشناس تھے۔ سلطان علاؤالدین تکش خوارزم شاہ نے امام صاحب کو اپنے بیٹے محمدؒ بن تکش خوارزم شاہ کا استاد مقرر کیا۔ جب محمدؒ بن تکش خوارزم شاہ تخت پر بیٹھا تو ان کی قدر و منزلت اور

جاہ و عزت میں اَور اضافہ ہو گیا۔ اس لحاظ سے دربار میں آپ کا کوئی حریف نہ تھا۔

امام صاحب شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ درس و تدریس اور وعظ و ارشاد کا سلسلہ بدستور تھا، مگر ان کی مجلسِ درس و وعظ میں بھی شاہانہ شان و شکوہ پایا جاتا تھا۔ محی الدین قاضی مرند کہتے ہیں کہ:

"میں نے امام صاحب سے ہمدان اور ہرات میں تعلیم حاصل کی، ان کی مجلسِ درس میں بڑی شان پائی جاتی تھی۔ وہ بادشاہوں سے بھی عظیم نظر آتے تھے"۔

ایک مرتبہ ہرات تشریف لے گئے۔ وہاں بادشاہ حسین بن خرمین نے ان کا استقبال کیا ان کے لیے جامع مسجد کے صدر ایوان میں ایک ممبر نصب کروایا۔ امام اس ممبر پر تشریف فرماتے اور ان کے دائیں بائیں ان کے ترکی غلاموں کی دو صفیں تلواروں سے ٹیک لگائے کھڑی تھیں۔ ایک ہجوم خلائق ان کا وعظ سننے اُمڈ آیا تھا۔

ایسے ہی ایک موقعہ پر انہوں نے وعظ میں سلطان شہاب الدین سے کہا تھا: اے سلطانِ عالم، نہ تیرا اقتدار رہے گا، نہ رازی کا تملق و نفاق۔ سلطان بے حد متاثر ہوا اور زار زار رونے لگا۔

امام صاحب کی سواری چلتی تھی تو شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ۔ غلاموں کے علاوہ تین سو شاگرد ان کے جلو میں چلتے تھے۔

آخری عمر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے اور تصوف کی طرف رجحان ہو گیا تھا۔ زندگی میں یہ انقلاب بھی عجیب انداز میں آیا۔

امام صاحب جہاں جاتے، ایک دنیا ملاقات اور زیارت کو امنڈ آتی تھی۔ علماء، صلحاء، امراء اور سلاطین، عوام و خواص سبھی حاضر ہوتے۔ ایک مرتبہ ہرات تشریف لے گئے تو حسبِ دستور ہر طبقے کے لوگ ملاقات کو آئے۔ امام صاحب نے ایک دن دریافت کیا: "کوئی شخص ایسا بھی ہے، جو ہماری ملاقات کو نہیں آیا"؟ لوگوں نے کہا:

"صرف ایک مردِ صالح شیخ نجم الدّین رہ گئے ہیں، وہ اپنے زاویے میں گوشہ نشین رہتے ہیں"۔ امام صاحب نے فرمایا: "میں مسلمانوں کا امام اور لائقِ تعظیم شخص ہوں، پھر شیخ مجھ سے ملاقات کے لیے کیوں نہیں آئے"؟ شیخ نے سُنا تو خاموش رہے۔ ایک روز دونوں ایک دعوت میں جمع ہوئے۔ امام صاحب نے ملاقات نہ کرنے کی وجہ دریافت کی۔ شیخ نے کہا: "ایک فقیر کے ملنے نہ ملنے سے آپ کے شرف میں نہ اضافہ ہو سکتا ہے نہ کمی"۔ امام صاحب اس جواب پر چونک سے گئے، فرمایا: "یہ طرزِ کلام تو اربابِ ادب (صوفیہ) کا ہے، حقیقتِ حال کیا ہے؟" شیخ نے کہا: "آپ سے ملاقات کس بنا پر واجب ہے؟" امام صاحب نے فرمایا: "مَیں مسلمانوں کا امام اور لائقِ تعظیم ہوں"۔ شیخ نے کہا: "علم آپ کا سرمایۂ فخر ہے، لیکن سرچشمۂ علوم معرفتِ الٰہی ہے، آپ کو اللہ کی معرفت کیسے حاصل ہوئی"؟ امام صاحب نے فرمایا "سو دلیلوں سے"۔ شیخ نے کہا: "دلیل کی ضرورت تو شک وریب کے ازالے کے لیے ہوتی ہے، مگر خدا نے مجھے ایسی روشنی سے بہرہ ور فرمایا ہے کہ میرے دل میں شک کا گذر ہو ہی نہیں سکتا، پھر مجھے دلیل کی ضرورت کیوں ہو؟"

امام صاحب بے حد متاثر ہوئے اور اسی مجلس میں شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی اور خلوت نشین ہو کر سلوک وطریقت میں گُم ہو گئے۔ پھر خلوت سے نکلے تو تفسیرِ کبیر لکھنی شروع کی۔

امام صاحب اس سے پیشتر بھی بہت سی کتابیں لکھ چکے تھے، مگر تفسیرِ کبیر کا انداز کچھ اَور ہی ہے، اس میں فلسفیانہ متکلمانہ مباحث کے ساتھ تصوف کا رنگ بھی ہے۔ تفسیرِ کبیر ہی میں تحریر فرمایا ہے کہ: "اس علم کی خدمت کی وجہ سے مجھے مختلف قسم کی جو دینی اور دنیوی سعادتیں میسّر آئیں، وہ اور علوم کی وجہ سے حاصل نہیں ہوئیں"۔

امام صاحب نے ۶۰۶ھ میں بروز دوشنبہ ہرات میں وفات پائی۔ انہیں فرقۂ کرامیہ کے بعض لوگوں نے زہر دلوا دیا تھا۔ اس وقت آپ ۶۳ برس کے تھے۔ ہرات ہی

میں مدفون ہوئے۔ امام صاحب دولت و تموّل کے باوجود ان تمام مکارمِ اخلاق سے بہرہ مند تھے جو صلحائے امت کا نشانِ خاص رہے ہیں۔ اپنے وقت کے زبردست فلسفی اور متکلم تھے، مگر بوڑھی عورتوں کے دین کی پابندی ہی میں فلاح و کامیابی سمجھتے تھے۔ وفات کے قریب سارے لونڈیوں اور غلاموں کو مال دے کر آزاد کر دیا تھا۔ شاہی درباروں سے تعلق کبھی حق گوئی میں مانع نہ ہوا۔ نہایت فیّاض تھے۔ عربی اور فارسی میں شعر بھی کہا کرتے تھے۔

امام صاحب کثیر التصانیف تھے۔ تقریباً ہر فن میں کتابیں لکھیں۔ علمِ کلام، علمِ فقہ اور تفسیر میں ان کی کتابیں نہایت بلند پایہ ہیں۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں متقدمین اور متاخرین دونوں سے فائدہ اٹھایا۔ امام صاحب کی تصانیف کی اہم خوبی یہ ہے کہ ان کے اندر تصنیفی و تالیفی نقطۂ نظر سے ایک نیا طرز اختیار کیا۔ ان کتابوں کے ذریعے خیالات میں انقلاب پیدا ہوا، اس طرح علومِ اسلامیہ کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ امام صاحب مشکل سے مشکل مسائل کو نہایت آسان انداز میں بیان کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ اس طرح انھوں نے فلسفہ و کلام کے پیچیدہ مسائل کی تفہیم میں آسانیاں پیدا کیں اور ان کی تہذیب و تنقیح کی؛ تاہم ان کی تصانیف کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ وہ مخالف کے نقطۂ نظر کو بڑے زور و قوّت کے ساتھ بیان کرتے ہیں، مگر اس کی تردید پہ آتے ہیں تو اس میں وہ جوش و قوّت مفقود ہوتی ہے۔ نہایت وسیع النظر متبحّر عالم اور جامع العلوم تھے۔ شبلی نعمانی ان کی تصنیف تفسیرِ کبیر کے متعلق لکھتے ہیں:

"اگرچہ جیسا کہ ان کا عام انداز ہے، وہ وسعتِ بیان اور متبحّرِ علمی کی رَو میں رطب و یابس کی تمیز نہیں کرتے اور سیکڑوں ایسی اوچھی اور سرسری باتیں لکھ جاتے ہیں، جو ان کے رتبے کے بالکل شایان نہیں ہوتیں؛ تاہم ان حشو و زوائد کے ساتھ سیکڑوں ایسے دقیق اور معرکتہ الآرا مسائل حل کیے ہیں، جن کا کسی اَور کتاب میں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔"

س

۱۴۱- شیخ سلیم چشتیؒ

حضرت شیخ فرید گنج شکر کی اولاد میں سے تھے - والد کا نام بہاؤالدّین تھا۔ آپ کے پر دادا شیخ سلیمان پاک پتن سے لدھانہ جا رہے تھے - والد لدھانہ سے دہلی چلے گئے۔ شیخ سلطان بہلول لودھی کے زمانے میں دہلی میں پیدا ہوئے - نو سال کے تھے کہ آپ کے والدین سیکری میں منتقل ہو گئے - چودہ برس کی عمر میں تحصیل علم کے لیے سیکری سے نکلے - سرہند میں شیخ مجدالدّین سے علم حاصل کیا - پھر خشکی کی راہ سے عالم اسلام کی سیاحت کے لیے نکل کھڑے ہوئے - تیس سال تک رُوم و شام، عرب، عراق اور مصر کی سیاحت کی - اس دوران میں چودہ حج کئے - معمول یہ تھا کہ سال بھر سیر و سیاحت میں مصروف رہتے، موسم حج میں مکہ معظّمہ پہنچ جاتے - ۹۳۷ھ میں واپسی ہوئی - ۹۶۲ھ میں بحری راستے سے حج کو گئے اور آٹھ سال تک حرمین شریفین میں مقیم رہے - ۹۷۱ھ میں ہندوستان واپس آئے - بلادِ عرب میں شیخ سلیم "شیخ الہند" کے نام سے مشہور تھے -

شیخ سلیم اگرچہ اکابرِ صوفیہ میں سے نہیں ہیں تاہم راہ سلوک و طریقت کی منازل انھوں نے بھی طے کی تھیں اور اس راہ میں سخت مجاہدے اور ریاضتیں کی تھیں - مدتوں فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی - اپنی سیاحت کے پہلے دورے میں بصرہ میں خواجہ ابراہیم عرب سے خرقہ حاصل کیا - اتباعِ شریعت میں بڑی مشقتیں برداشت کرتے تھے - طہارت کا بڑا اہتمام کرتے - نماز باجماعت کبھی فوت نہیں ہوئی - عربی انشاء میں مہارت رکھتے تھے - سخت جاڑوں میں بھی بس ایک باریک کرتہ اور ململ کی چادر زیب تن رہتی —— روزانہ دو مرتبہ غسل کرتے —— چلّہ میں وصال کے روزے رکھتے تھے اور آدھے

تربوز بلکہ اس سے بھی کم پر گذارا کر لیتے تھے۔ لیکن ان کے ہم عصر شیخ عبدالحق محدّث دہلوی کا بیان ہے کہ آخر میں ان کے اندر زبردست انقلاب آ گیا تھا۔ انھوں نے عمارتیں تعمیر کروانا شروع کیں، باغات لگوائے، کنوئیں کھدوائے اور شریعت کے خلاف بعض عادتیں ان میں بھی پیدا ہو گئیں۔ زندگی میں یہ انقلاب شاہی دربار سے وابستگی کے جلو میں آیا۔ ملّا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں شیخ چشتی نے بادشاہ سے اپنے گھر کی خواتین کا پردہ اٹھا دیا تھا۔ ان کے اعزّہ اور بیٹوں نے اعتراض کیا آپ نے تو ہماری عورتوں کو ہم سے بیگانہ کر دیا ہے۔ شیخ نے جواب دیا: میں نے تمہیں امیر بنا دیا ہے۔ دنیا میں عورتوں کی کمی نہیں۔ اور کر لو۔ آخر اس میں کیا ہرج ہے ؎

یا مکن با فیل بانان دوستی
یا بنا کن خانۂ در خورد فیل"

شیخ شیر شاہ اور سلیم شاہ کے عہد میں بھی بڑے اعزاز کے حامل تھے۔ اکبر کے عہد میں تو "شاہی پیر" بن گئے۔ ۹۷۱ھ میں فتح پور میں ایک نئی خانقاہ تعمیر کروائی جو آٹھ سال میں مکمل ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ یہاں ایک بستی بس گئی۔ شیخ ۹۰ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

ش

۱۵۔ شاہجہان

خرم نام تھا اور شہاب الدین شاہجہان لقب۔ ۱۵۹۲ء میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی سے نہایت ہونہار اور ذہین تھا۔ ابوالفضل کی زیرِ نگرانی وقت کے تمام مروجہ علوم کی تعلیم حاصل کی۔ فنِ حرب میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ اپنے خسر آصف خاں کی مدد سے تخت نشین ہوا۔ شاہجہان حضرت مجددؒ اور ان کے خانوادے کا عقیدت مند تھا۔ ذہناً اور عملاً مسلمان تھا۔ تخت نشین ہونے کے فوراً بعد اس نے خلافِ شریعت احکام منسوخ کر دیئے۔ بادشاہ کو سجدۂ تعظیمی کرنے کا حکم بھی موقوف کر دیا۔ البتہ کورنش کا رواج باقی رکھا۔ یعنی جب بھی کوئی شخص بارگاہِ شاہی میں حاضر ہوتا اپنا دایاں ہاتھ زمین پر لگاتا اور اس کی پشت چوم کر کھڑا ہو جاتا۔ دسویں سالِ جلوس میں اسے بھی منسوخ کر دیا۔ صرف شرعی سلام دربار کا سلام مقرر ہوا۔ شاہجہان کے دربار میں اگرچہ بڑے بڑے علماء، فضلاء اور شاعر تھے۔ مگر خود وہ علمی ذوق سے زیادہ تعمیری ذوق رکھتا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے ایسی تعمیری یادگاریں چھوڑیں جو آج بھی اپنی خوبصورتی، دلکشی اور عظمت میں لاثانی ہیں۔

۱۶۔ مُلّا شیری

پنجاب کے ایک گاؤں کوکو کا رہنے والا تھا۔ ناخواندہ تھا، لیکن فطرتِ عالی اور طبعِ رسا پائی تھی۔ اپنے باپ مولانا یحییٰ کی تربیت نے اسے کندن بنا دیا تھا۔ ابوالفضل کا بیان ہے شیری کی شاعری اکبر کے فیضانِ نظر کی مرہونِ منت تھی۔ بنظرِ گیتی خداوند درِ سخن بروئے او کشودند۔ بڑا ہی باکمال آدمی تھا۔ مآثرِ رحیمی کے مؤلف کا بیان ہے:

بہمال حیثیات آراستہ وپیراستہ است وطبعش خالی از متانتی وپختگی نیست و اشعار او در ہندوستان مشہور است"۔

بدایونی تو مُلّا شیری کے بے حد مدّاح ہیں۔ شعروسخن پر پوری طرح قادر تھا۔ قصیدہ اور قطعہ گوئی میں اپنے ساتھیوں میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ بڑا ہی پُر گو تھا۔ خود کہتا تھا کہ اس نے ایک مرتبہ ایک رات میں تیس غزلیں کہیں۔ اس ضمن میں ایک لطیفہ بھی مشہور ہے۔ ایک دن وہ محفل میں اپنے دیوان کا ایک قطعہ پڑھ رہا تھا جب اس نے یہ مصرع پڑھا۔

ع چار دفتر شعر در آبِ چناب انداختم

مولانا الہ داد امروہی نے برجستہ کہا۔ اگر تم اس پرزے کو بھی آبِ چناب میں ڈال دیتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

طبقاتِ اکبری جلد دوم صفحہ ۴۹۱ میں ہے کہ اس نے آفتاب پر ایک "مثنوی شمعِ جہاں افروز" کے نام سے لکھی تھی۔ جس میں ایک ہزار اشعار تھے۔

نہایت خود دار اور فقیر منش آدمی تھا۔ خود کہتا ہے:

صاحبِ خواں فقیرم و ہرگز
ہمّتِ من نخواہد از جاناں
قرضِ ہندو بشرطِ دہ پنجاہ
بہ کہ انعامِ ایں مسلماناں

جس زمانے میں اکبر کا رہوارِ الحاد خوب جولانیوں پر تھا اور نبوّت والوہیت کے آسمانوں کی خبر لا رہا تھا، شیری نے ایک قطعہ کہا، جس میں بڑی عمدگی کے ساتھ اس دورِ پُر آشوب کی عکاسی کی:

تا بزاید ہر زماں کشور بر انداز آفتی
فتنۂ در کوئے حوادث کہ خدا خواہد شدن

باعقابِ قرض خواہ تیغ در اربابِ شرک
بارِ سر از ذمۂ گردن ادا خواہد شدن
فیلسوفِ کذب را خواہد گریباں پارہ شد
خرقہ پوشِ زہد را تقویٰ روا خواہد شدن
شورشِ مغز است اگر در خاطر آرد جاہلی
کز خلائق مہرِ پیغمبر جدا خواہد شدن
خندہ می آید مرا زیں بیت بس کز طرفگی
نقلِ بزمِ منعم و وردِ گدا خواہد شدن
بادشاہ امسال دعویٰ نبوت کردہ است
گر خدا خواہد پس از سالی خدا خواہد شدن

لیکن پھر یہی ملا شیری "شورشِ مغز" کا شکار ہو گئے۔ خودداری اور فقیر منشی کو خیر باد کہا اور خوشامد پیشگی اختیار کی۔ بقول بدایونی "بادشاہ کی خوشامد میں "ہزار شعاع" کے عنوان سے ایک نظم کہی جس میں آفتاب کی تعریف و توصیف کی گئی تھی اور جو ہزار قطعات پر مشتمل تھی۔ جسے بادشاہ نے بے حد پسند کیا"۔ دین و دانش تج کر بادشاہ کے دین میں شامل ہو گئے۔

نمونۂ کلام :

دراں دلی کہ توئی یادِ دیگری کردن
درونِ کعبہ پرستیدن ست عزیٰ را

•

کارواں گو تیز تر میراں کہ از دردِ فراق
مصر فریادِ زلیخا بر نتابد بیش ازیں

بے رخت دریائے درد و غم وجودِ ما بود
استخواں پہلوئے ما موجِ آں دریا بود

•

بکف تیغِ ستم از بہرِ قتلم تیز می آید
ز بیداد آنچہ می گویند ازاں خونریز می آید

•

چرا اے اشک در چشم از وداعِ یار می گردی
کی بودی کہ اکنوں مانعِ دیدار می گردی
سراپا جاں اے بادِ صبا در قالبِ شوقم
مرت گردم مگر در کوئے اُو بسیار می گردی

۹۹۴ھ میں کوہستان یوسف زئی میں انتقال کیا۔

ص

۱۷۰۔ مفتی صدر جہاں پہانی

صدر جہان پہانی کے رہنے والے تھے جو قنوّج کے علاقے میں ایک گاؤں تھا۔ علوم و کمالات کی تحصیل شیخ عبدالنبی سے کی اور انہی کی سعی و جہد سے سرکار دربار میں جگہ پائی اور مختلف دینی مناصب پر فائز رہے۔ مآثر الامراء جلد سوم میں ہے ——

"مردِ فاضل و خوش طبع بود"۔

مُلّا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں —— "جب ہندوستان کے ائمہ زوال سے دوچار ہوئے، میراں صدر جہاں اپنی خدمات، زمانہ سازی اور دنیاداری کے طفیل جلد ہی مسندِ عزت و اکرام پر فائز ہو گئے ...... جن دنوں رہے سہے علماء کو بھی مکّہ معظّمہ بھجوا دینے کی افواہیں گرم تھیں۔ اور ایک طویل فہرست مرتب کی گئی تھی۔ ایک دن صدر جہاں کہنے لگے: "مجھے اندیشہ ہے کہیں میرا نام بھی فہرست میں نہ ہو" یہ فہرست میرزا نظام الدّین احمد نے مرتّب کی تھی"۔ کہا: کبھی کلمۂ حق تو تمہاری زبان سے نکلا نہیں۔ پھر تمہیں بادشاہ کس لیے بھیجیں گے؟

اکبر کے عہدِ حکومت میں ممالکِ محروسہ کے صدر بھی رہے۔ حکیم ہمام کے ساتھ عبداللہ خان ازبک والئی توران کے پاس سفیر بنا کر بھیجے گئے۔ وہاں کے علماء کے ساتھ زبردست علمی معرکے رہے اور صدر جہاں ہر معرکے میں فتحیاب و غالب رہے اور اپنی علمی عظمت کا سکّہ بٹھایا۔ واپسی پر صدارتِ کل کی خدمت تفویض ہوئی اور جب اپنے دونوں بیٹوں سمیت بادشاہ کے مریدانِ خاص میں شامل ہوئے تو دو ہزاری منصب پر سرفراز ہوئے۔ بقول بدایونی۔ یہ منصب اسی مریدی کا صلہ تھا۔ مرید ہونے کے بعد بادشاہ سے پوچھا داڑھی کے متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے، رہنے دوں یا صاف کروا دوں۔ بادشاہ نے از راہ لطف و کرم مفتی صاحب

کو داڑھی سے تعرّض نہ کرنے کی اجازت دے دی۔

طبیعت شاعرانہ تھی اور شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ تاہم شعر گوئی سے محترز ہی رہے۔ ان کا ایک مطلع بڑا مشہور ہے۔

ہر تار زلفِ یار خدایا بلا شود
وانگہ بہر بلا دل ما مبتلا شود

مُلّا عبدالقادر بدایونی نے شعر گوئی سے اس اجتناب پر تبصرہ کرتے ہوئے توقّع ظاہر کی تھی کہ "جس طرح شعر گوئی سے تائب ہو گئے ہیں، بے لطف بحث و تمحیص، ریاکاری، خودنمائی، خودپسندی، لغو گوئی اور لاف و گزاف سے تائب ہونے کی توفیق نصیب ہو جائے گی"۔ بدایونی کی یہ توقّع بر آئی، مفتی صدر جہاں کی زندگی میں تغیّر آیا۔ جہانگیر کے عہد میں انہوں نے رخِ حالات کو بدلنے میں مؤثّر حصّہ لیا۔ جہانگیر ان کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا۔ شہزادگی کے زمانے میں اسے پتہ چلا صدر جہاں مقروض ہیں تو اس نے وعدہ کیا کہ تخت و تاج کا مالک ہوا تو ان کا سارا قرضہ ادا کر دے گا اور ان کی خواہش کے مطابق منصب پیش کرے گا، چنانچہ ایسا ہی کیا۔ صدر جہاں کو صدرالصّدور مقرّر کیا، چار ہزاروی منصب عطا کیا اور قنّوج کا علاقہ تنخواہ میں دے دیا۔ مآثرالامرا میں ہے۔ صدرِ جہاں نے جہانگیر کی نوازشات سے فائدہ اٹھایا۔ خلقِ خدا کی بڑی خدمت کی اور ان کی مددِ معاش کے سلسلے میں بڑی فیّاضی کا مظاہرہ کیا، چنانچہ آصف خاں جعفر نے ایک موقع پر جہانگیر سے کہا بھی کہ عرش آشیانی (اکبر) نے جو بخشش پچاس سال میں کی تھی۔ صدر جہاں نے پانچ سال کی صدارت میں کی۔

۶

۱۸- شیخ عبدالحق محدّث دہلوی رح

شیخ عبدالحق محدّث دہلوی رح کے آباؤ اجداد کا تعلق بخارا سے تھا۔ علاؤالدّین خلجی کے عہد میں برِّصغیر میں وارد ہوئے، دہلی میں توطّن اختیار کیا اور ممتاز فوجی مناصب پر فائز ہوئے۔ شیخ کے دادا شیخ سعداللہ اور والد شیخ سیف الدّین راہِ سلوک وطریقت کے راہرو تھے۔ شیخ سیف الدین شیخ امان پانی پتی کے مرید تھے اور وحدت الوجود کے قائل۔ —— تاہم شیخ عبدالحق کی تعلیم وتربیت ایک دوسرے ہی ڈھب پر ہوئی، جس کے نتیجے میں شیخ ہندوستان میں اقلیمِ حدیث کے تاجور قرار پائے۔

شیخ بچپن ہی سے علم کے بڑے شائق تھے۔ کھیل کود، آرام وآسائش اور بیکار وقت کا ضیاع آپ کو پسند نہ تھا۔ رات گئے تک مطالعہ میں مصروف رہتے۔ مطالعہ میں انہماک کا یہ عالم تھا کہ کھانا تک بھول جاتے۔ ایک مرتبہ اسی انہماک میں چراغ کی لَو سے پگڑی کو آگ لگ گئی اور پتہ اس وقت چلا جب سر کو حرارت محسوس ہوئی۔ بائیس سال کی عمر میں تکمیلِ علم کی۔ پھر دارالسّلطنت فتح پور سیکری، جو ان دنوں علماؤ فضلاء کا مرکز تھا، چلے گئے۔ شیخ یہاں دس بارہ برس تک درس وتدریس میں مشغول رہے۔ اس دوران میں شاہی دربار سے بھی تعلق پیدا ہوا۔ ابوالفضل، فیضی، مرزا نظام الدّین بخشی، مُلّا عبدالقادر بدایونی سے راہ ورسم پیدا ہوئی۔ یہ حضرات شیخ کے علم سے بے حد متاثر تھے۔ ان کے ذریعے بادشاہ تک پہنچے۔ اس وقت شاہی دربار ملحدانہ افکار ونظریات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ شیخ خود کہتے ہیں کہ بادشاہِ وقت اور امراء نے انہیں اپنی جماعت میں شامل کرنے اور اپنی قوت بڑھانے کی کوشش کی، لیکن وہ اِس دامِ خوش رنگ میں نہ آئے۔ انہوں نے شیخ موسیٰ گیلانی رح کے

ہاتھ پر بیعت کی تھی، جو بڑے دبنگ عالمِ حق اور شیخِ طریقت تھے۔ بادشاہ کی حاضری کے دوران میں نماز کا وقت آ جاتا تو اٹھ کھڑے ہوتے، وہیں اذان کہتے اور بادشاہ کے سامنے باجماعت نماز پڑھتے۔ بادشاہ اور دوسرے ملحد امراء بس دیکھتے رہ جاتے۔ انہی شیخ کے فیضِ صحبت سے شیخ عبدالحق محدّث بہرہ یاب ہوئے تھے۔ انہوں نے دربار چھوڑ دیا، قدیمی تعلّقات کو خیر باد کہا اور حجّ بیت اللّٰہ کے ارادے سے نکل کھڑے ہوئے۔ زادِ راہ پاس نہ تھا، توکّل بر خدا گجرات تک پہنچے، جہاں مرزا نظام الدّین بخشی نے زادِ سفر کا انتظام کر دیا۔

شیخ نے مکّہ معظّمہ میں وہاں کے ممتاز محدّثین سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا درس لیا۔ پھر شیخ عبدالوہاب متّقی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ کیا۔ شیخ مالوہ کے رہنے والے تھے اور مکّہ معظّمہ میں مقیم ہو گئے تھے اور وہاں شیخ عبدالوہاب الہندی کہلاتے تھے۔ شیخ عبدالوہاب نظریۂ وحدت الوجود اور صوفیاء کے غیر شرعی خیالات و افکار کے کڑے ناقد تھے۔ ظاہر و باطن کو سنّتِ نبوی کے مطابق آراستہ کرنے پر بہت زور دیتے تھے اور متصوّفین نے ظاہر و باطن اور شریعت و طریقت میں جو تفریق پیدا کر دی تھی، اسے غلط قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک مسلکِ طریقت وہی مطابقِ حق تھا جو احکامِ شریعت سے رُوگردانی اور بے نیازی پر مبنی نہ ہو۔ شیخ عبدالوہاب ذکر و فکر، اوراد و وظائف سے زیادہ نکو عملی، اخلاق کی تہذیب اور علومِ دینی کی نشر و اشاعت کو اہمیّت دیتے تھے۔ شیخ عبدالحق کو قیامِ مکّہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ فکر و عمل میں انہی کے رنگ میں رنگ گئے۔

آخر شیخ عبدالوہاب ہی کی ہدایت اور اصرار پر وطن واپس تشریف لائے اور دہلی میں درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور اشاعتِ حدیث و سُنّت میں مصروف ہو گئے۔ فیضی نے ہر چند پرانے تعلّقات تازہ کرنے چاہے، مگر شیخ دامن کش رہے۔ شیخ عبدالحقؒ کے عہد میں گوناگوں فتنے اور غلط نظریات و افکار پھیل چکے تھے۔ تصوّف اور متصوّفین کی خیال آرائیوں اور شطحیات کو ان میں زیادہ دخل تھا۔ عوام ہی نہیں، اصحابِ علم بھی ان خیال

آرائیوں اور شطحیات سے متاثر ہو رہے تھے۔ شیخ کے خیال میں ان غلط نظریات کا بڑا سبب حدیث و سُنّت سے بے خبری تھا؛ چنانچہ انہوں نے علمِ حدیث و سُنّت کی ترویج و اشاعت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔

شیخ کا شمار برِّصغیر کے ممتاز افاضل اور علمائے حدیث کے پیشروؤں میں ہوتا ہے۔ امام حسن بن محمّد صنعانی پہلے محدّث تھے جن کے ذریعے علمِ حدیث کی روشنی برّصغیر میں پھیلی۔ قطب الدّین ایبک نے انہیں لاہور کی مسندِ قضا تفویض کی تھی۔ ایک مدّت تک اس منصب پر رہے اور پھر بغداد چلے گئے۔ وہیں خلیفہ مستنصر باللہ کی فرمائش پر "مشارق الانوار" لکھی۔ "مشارق الانوار" برّصغیر میں بے حد مقبول ہوئی۔ مدارس کے نصاب میں شامل کی گئی اور علمائے نے شرحیں لکھیں۔ سولہویں صدی عیسوی میں علاؤالدین علی نے کنزالعمال لکھ کر برّصغیر کے ذخیرۂ کتب احادیث میں بیش قیمت اضافہ کیا؛ تاہم شیخ عبدالحق رح پہلے عالمِ دین تھے، جنہوں نے برّصغیر میں حدیث کے فروغ و اشاعت کو اپنی زندگی کا مشن بنایا۔ شیخ نے حدیث پر ایک درجن کتابیں لکھیں، جن میں مشکوٰۃ المصابیح کی عربی شرح لمعات التنقیح اور فارسی شرح اشعۃ اللمعات خاص طور پر مشہور ہیں۔ شیخ محدّث رح نے مجدّ الدین فیروز آبادی کی کتاب سفر السعادۃ کی شرح بھی لکھی۔ ان کے فیضِ بے بہا سے دہلی علمِ حدیث کا مرکز بن گیا تھا۔

شیخ عبدالحق کے علم و فضل اور خدمتِ حدیث و سُنّت کا اعتراف ہر دور میں کیا گیا ہے۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:

"علومِ عقلی و نقلی دونوں سے بہرۂ وافر ملا ہے اور مجموعۂ ہنر و کمال ہیں، تصوّف میں بھی مقامِ بلند رکھتے ہیں۔"

خافی خاں منتخب اللباب میں لکھتا ہے:

"علومِ عقلی و نقلی پر ایک سو کتابیں تالیف کی ہیں۔ شرح مشکوٰۃ اور تاریخِ مدینہ خاص

طور پر قابلِ ذکر ہیں ...... کہتے ہیں کہ کعبۃ اللہ سے واپسی پر آپ کی زبانِ صداقت بیان پر یہ کلمہ جاری تھا: جب تک میں نے بیت اللہ جاکر اور وہاں ایک مدت تک مقیم رہ کر احادیث کی تحقیق میں وقت صرف نہ کیا، مجھے خبر نہ تھی کہ بہت سی مشہور احادیث موضوع ہیں"۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں لکھتے ہیں :

"مختلف علومِ دینی خصوصاً حدیث شریف کے علم کی نشر و اشاعت اس نہج پر کی کہ دیارِ عجم کے علمائے متقدمین و متاخرین میں سے کسی کو یہ امتیاز حاصل نہ ہو سکا۔ علمی فنون، خصوصاً فنِ حدیث پر قابلِ اعتماد کتابیں تصنیف کیں، چنانچہ ہر زمانے کے علمائے نے ان سے اکتسابِ علم کیا اور اپنا دستور العمل بنایا ہے"۔

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں :

"مولانا جمال الدین رح کے آخری عہد میں شیخ عبدالحق حجاز سے واپس آئے۔ اللہ نے ان کی عمر مبارک میں بڑی برکت دی اور ان کے درس و تصنیف نے ایک پورا سلسلۂ تعلیم ملک میں عام کیا۔

حضرت شاہ عبدالحق محدث جس دورِ علم و تعلم کے بانی ہوئے، اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ علمِ حدیث کے متعلق فارسی زبان میں جو ملک کی عام زبان تھی۔ تصنیف و تراجم کی بنیاد ڈالی گئی۔ خود شاہ صاحب نے "مشکوٰۃ" وغیرہ کا ترجمہ کیا۔ پھر ان کے صاحبزادے شیخ الاسلام نور الحق نے صحیح بخاری کا"۔

اس سلسلے میں نواب صدیق حسن خان کی رائے کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا تاکہ ایک رہ النقطۂ نگر بھی سامنے آجائے۔

"حنفی فقیہ اور دینِ حنیف کے علامہ ہیں۔ انہیں علوم سنتِ سنیہ میں مہارت سے زیادہ فقہ میں دستگاہ حاصل ہے۔ اس لیے اہل الرائے کی جانب داری کی طرف

مائل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ جگہ جگہ سُنّتِ صحیحہ کی حمایت بھی کی ہے۔ طالب علم کو چاہیئے کہ ان کی تصانیف میں "خذ ما صفا ودَعْ ما کدر" کو پیشِ نظر رکھے"۔

جہانگیر نے شیخ محدّث سے ملاقات کے بعد توزک میں لکھا:

"دہلی کے گوشے میں بیٹھ کر توکّل اور تجرید کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی صحبت بے ذوق نہیں ہے"۔

شیخ محدّث بڑے حق گو اور حق پسند تھے۔ نصیحتِ حق کی خاطر ذاتی تعلقات اور عقیدت و محبّت کے رشتوں کی پروا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت مجدّد الف ثانی رح کے بعض خیالات پر انہوں نے بلا تامّل گرفت کی تھی۔ شیخ محدّث شاعر بھی تھے اور حقی تخلص کرتے تھے۔ ۹۴ سال دو ماہ عمر پائی۔ شاہجہان کے عہد (۱۶۴۲ء) میں انتقال فرمایا۔

۱۹۔ عبدالرحیم خانخاناں

بیرم خان خانخاناں کا شمار برِصغیر میں تیموری سلطنت کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ عبدالرحیم اسی کا بیٹا تھا۔ ۹۶۴ھ میں لاہور میں پیدا ہوا۔ بیرم خاں کے قتل کے وقت عبدالرحیم تین برس کا تھا۔ اس کی ماں حسن خان میواتی کی بھتیجی سلیمہ سلطان بیگم تھی۔ جسے بعد میں اکبر نے اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ اس لیے اس کی پرورش اور تربیت اکبر ہی کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ اکبر اسے مرزا خان کہا کرتا تھا۔ بڑا ہی شکیل و وجیہہ تھا۔ تیغ و قلم دونوں کا دھنی تھا۔ تیرہ برس کی عمر میں گجرات کی جنگ میں حصہ لیا اور بڑی بہادری سے لڑا۔ آگے چل کر سپہ سالار کے منصب پر فائز اور خانخاناں کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ احمد نگر، گجرات اور ٹھٹھہ و سندھ کی فتح اکبر کے دَور میں اس کے نمایاں ترین کارنامے ہیں۔ اس طرح اس نے مغلیہ سلطنت کی حدود بڑھانے میں اہم حصہ لیا۔ علمی و ادبی لحاظ سے خانخاناں کا درجہ نہایت ممتاز اور بلند تھا۔ عربی، ترکی،

فارسی، سنسکرت اور ہندی پر عبور حاصل تھا۔ فارسی اس کی مادری زبان تھی۔ اس کی فارسی نثر نہایت شستہ، سادہ اور شگفتہ تھی۔ تزک بابری کا فارسی ترجمہ اسی کے قلم سے ہے جو اپنے سادہ و شگفتہ اندازِ بیان کے لحاظ سے آج بھی فارسی نثر میں یکتا مقام رکھتا ہے۔

اقبال نامہ کا مصنّف خانخاناں کے تذکرے میں لکھتا ہے:

"اس دولتِ ابدی کے عظیم ترین امراء میں سے تھا۔ حضرت عرش آشیانی کے عہدِ سلطنت میں اپنی شائستہ خدمات اور نمایاں فتوحات کی بدولت بڑا نام پیدا کیا...... خانخاناں بڑا ہی لائق، صاحبِ کمال اور علم و ہنر میں یکتائے زمانہ تھا۔ عربی، ترکی، فارسی اور ہندی زبانیں خوب جانتا تھا۔ فارسی و ہندی میں اچھے شعر کہتا تھا اور اچھا سخن فہم تھا۔"

خانخاناں عربی میں بھی اعلیٰ لیاقت رکھتا تھا۔ نہایت دقیق، مغلق اور مشکل عربی عبارت کے معنی نہایت آسانی سے بیان کر دیتا۔ مآثرِ رحیمی میں ہے ایک مرتبہ شریفِ مکہ نے اکبر کو ایک خط لکھا۔ اس کی عبارت اتنی مشکل اور دقیق تھی کہ ابوالفضل اور فتح اللہ شیرازی لغت کے بغیر اس کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ خانخاناں نے فوراً خط لیا۔ خط کی عبارت پڑھتا اور برجستہ ترجمہ کرتا چلا گیا۔

مآثر الامراء کا مصنّف لکھتا ہے:

"خانخاناں قابلیت و استعداد میں یکتائے زمانہ تھا۔ عربی، فارسی اور ترکی و ہندی زبان پر رواں تھی، شعر خوب سمجھتا اور کہتا تھا۔ رحیم تخلّص کرتا تھا۔ کہتے ہیں دنیا میں مروّج اکثر زبانوں میں مہارت رکھتا تھا۔"

خانخاناں فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ اس نے اپنے فارسی کلام کا ایک مجموعہ بھی مرتّب کیا تھا مگر اب نایاب ہے؛ البتہ مآثرِ رحیمی میں، جو عبدالباقی

نہاوندی نے خانخاناں کی زندگی ہی میں لکھی تھی۔ اس کے فارسی کلام کے نمونے بکثرت ملتے ہیں۔ خانخاناں اپنے عہد کے بڑے بڑے باکمال شعرائ کے مقابلے میں غزلیں کہتا تھا۔ فارسی نثر کی طرح فارسی شاعری میں بھی صفائی، دلآویزی اور شستگی ہوتی تھی، سوز و گداز سے بھی بہرۂ وافر ملا تھا۔ اس کے دربار میں شعر گوئی کا ہمیشہ چرچا رہتا تھا۔ طرحی مصرعوں پر غزلیں کہی جاتی تھیں۔ ایک بار طرح تھی، چنداست، پنداست، فرزنداست۔ اکبری دربار کے تمام شعرائ نے خیال آرائی کی مگر بازی خانخاناں لے گیا۔ اس کی اس غزل کے چند اشعار یہ ہیں:

شمارِ شوق ندانستہ ام کہ تا چنداست
جزیں قدر کہ دلم سخت آرزومند است

ادائے حقِ محبت عنایت است زِ دوست
وگرنہ خاطرِ عاشق بہ ہیچ خورسنداست

نہ زلف دانم و نے دام ایں قدر دانم
کہ پائے تا بسرم ہرچہ ہست در بنداست

بہ کیشِ صدق و صفا حرفِ عہد بیکاراست
نگاہِ اہلِ محبت تمام سوگند است

مرا فروخت محبت ولے ندانستم
کہ مشتری چہ کس است و متاعِ من چنداست

ازاں خوشم بسخنہائے دلکشِ تو رحیم
کہ اندکے بہ اداہائے عشق مانند است

خانخاناں کی ہندی شاعری کے متعلق مآثرِ رحیمی کا مصنف رقمطراز ہے:

"ہندی زبان میں خانخاناں نے بدِ بیضا کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس زبان میں اس

کے کتنے ہی ایسے پختہ اور دلنشیں شعر ملتے ہیں کہ خود اہلِ زبان کے ہاں نہیں ملتے۔
فارسی کے شعرا کو جس احسان و انعام سے نوازا ہندی زبان کے شعراء کے ساتھ بھی برابر وہی سلوک کیا۔ اس زبان کے شاعروں نے ان کی مدح و توصیف میں جتنا کچھ کہا ہے اس کے مقابلے میں فارسی شاعروں نے عشر عشیر بھی نہیں کہا۔"

خانخاناں کے پاس ایک بہت بڑا بے نظیر کتب خانہ تھا جو اس کے اعلیٰ علمی ذوق کی شہادت دیتا تھا۔ اس کتب خانے میں اس عہد کے مشہور شعراء نے اپنے دیوان خود لکھ کر داخل کئے تھے۔ دربارِ اکبری کے اکثر بلند پایہ شاعر عبدالرّحیم خانخاناں ہی کے صحبت یافتہ تھے۔ اس کی علم پروری اور فیاضی کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ شیرازی کو سونے میں تلوا دیا۔ نظیری نے ایک مرتبہ کہا اس نے ایک لاکھ روپے کا ڈھیر نہیں دیکھا۔ خانخاناں کے حکم سے ایک لاکھ کا ڈھیر اس کے سامنے لگا دیا گیا۔ پھر یہ ڈھیر اس کے گھر بھجوا دیا۔ گنگ کوئی نامی ایک ہندی شاعر کو اس نے ایک بار ۳۶ لاکھ روپے انعام میں دیے۔

عبدالرّحیم خانخاناں کا باپ بیرم خاں کا رجحان تفضیلِ علیؓ کی طرف تھا۔ اسی بنا پر بیرم خان کو شیعہ سمجھا جاتا ہے اور خانخاناں کے متعلق بھی یہی خیال کیا جاتا ہے۔ خانخاناں ایک غیر متعصب امیر تھا اس کے دربار سے شیعی اور سُنّی دونوں علمأ وابستہ تھے۔ خود وہ شیعہ سُنّی جھگڑوں سے بالاتر رہتا — پختہ دینی شعور رکھتا تھا اور حمیّتِ دین سے بھی بہرۂ وافر ملا تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے اس کی خط و کتابت رہتی تھی۔ حضرت مجدّدِ الف ثانی نے تو اس سے ملک میں دینی انقلاب لانے میں ممد ہونے کی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ خانخاناں اُن اکبری امرا میں سے ہے جن کی فکری تطہیر اور تربیتِ کردار سے حضرت مجدّدؒ کو بے حد دلچسپی تھی۔

۲۰ - مُلّا عبداللہ سلطانپوری

انصاری خانوادے کے فرد تھے۔ ان کے آبا و اجداد نے مضافاتِ لاہور میں سلطان پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اپنے عہد کے منفرد اور یگانۂ روزگار عالم تھے۔ عربی زبان پر استادانہ عبور حاصل تھا۔ اصولِ فقہ، تاریخ اور دوسرے علوم نقلی میں بھی گہرا درک رکھتے تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنّف تھے، جن میں "عصمت الانبیاءؑ" اور "شرح شمائل النبیؐ" بہت مشہور ہیں۔ لودیوں کے عہد سے اکبر کے ابتدائی عہد تک ان کی عظمت کا طوطی بولتا رہا۔ اس مدّت میں جتنے سلاطین اور بادشاہ ہوئے۔ سب ان کے علم وفضل کے قائل تھے۔ سکندر لودی تو انہیں اپنی ذات پر ترجیح دیتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ کہیں جا رہا تھا۔ عبداللہ سلطانپوری ان کے ساتھ تھے۔ اچانک ایک مست ہاتھی آتا دکھائی دیا۔ سکندر لودی خود آگے بڑھ کر سپر بن گیا۔ اور انہیں اپنے پیچھے کر لیا۔ مُلّا صاحب نے سلطان سے کہا کہ کہیں تخت و تاج ایک بادشاہ سے محروم نہ ہو جائیں۔ سلطان نے جواب دیا: تخت و تاج کو تو اور بادشاہ بھی میسر آ جائے گا، لیکن مولانا عبداللہ سلطان پوری پھر پیدا نہ ہوں گے۔

ہمایوں نے انہیں مخدوم الملک اور شیخ الاسلام کے خطاب سے سرفراز کیا۔ سُوری خاندان برسرِ اقتدار آیا تو اس کے ساتھ بھی مراسم برقرار رہے۔ شیر شاہ نے ان کو صدر الاسلام کا خطاب دیا۔ سلیم شاہ نے اپنے تخت پر بٹھا کر مروارید کی ایک تسبیح نذر کی جس کی قیمت بیس ہزار روپے تھے۔ وہ ان کا بے حد عقیدت مند تھا۔ سُوری خاندان کی بساطِ اقتدار الٹی تو ہمایوں نے پھر انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اکبر کے زمانے میں دیوان خانہ شاہی کے عہدہ پر فائز تھے۔ بڑے ہی جامد خیال، تنگ نظر اور متعصب تھے۔ ان کے نزدیک حق وہی تھا جسے وہ اپنے مسلک کے مطابق پاتے تھے۔ پہلے شاہی تقرّب اور پھر شیخ الاسلامی کے منصب نے انہیں مذہب کی دنیا کے سیاہ و سپید کا مالک بنا دیا تھا۔ اپنے دورِ اقتدار میں انہوں نے بلاشبہ ترویجِ شریعت

کی بھی سعی کی، لیکن فقہی عقائد میں غلو اور تنگ نظری نے انہیں بے حد متشدد بنا دیا تھا۔ جو شخص ان کی ہم نوائی نہ کرتا اس کی شامت آ جاتی۔ بدعت و الحاد، مہدویت اور رفض و تشیّع کا فتویٰ اس پر لگ جاتا اور پھر دار و رسن حرکت میں آ جاتے۔ فروعی اختلافات کو اصولی اختلافات سے بھی زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ تبلیغِ کتاب و سُنّت، علم و استدلال اور افہام و تفہیم پر اعتماد کرنے کے بجائے تلوار کی زبان میں بات کرتے۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی کے بقول انہیں اہل اللہ سے عداوت تھی۔ ان دنوں سیّد محمّد جونپوریؒ کی دعوتِ دینی شباب پر تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک اسلامی تحریک تھی جو برِّصغیر میں شریعتِ اسلامی کا نفاذ چاہتی تھی۔ سیّد محمّد جونپوریؒ کی طرف دعوئ مہدویت منسوب ہے۔ اس بارے میں اہل علم دو مختلف آراء رکھتے ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ انہوں نے صرف مہدی یعنی راہبر اور رہنما ہونے کا دعوٰی کیا تھا نہ کہ "المہدی" ہونے کا، جن کے بارے میں اُمّت کا مسلّمہ اعتقاد ہے کہ وہ قیامت کے قریب ظاہر ہوں گے۔ اس خیال کے مطابق بلاشبہ سیّد محمّد جونپوریؒ مہدی تھے۔ انہوں نے لوگوں کو دین کی دعوت دی، بدعات کا قلع قمع کیا اور کتاب و سُنّت کا نور پھیلایا۔ دوسرا گروہ کہتا ہے انہوں نے دعوٰی تو "المہدی" ہونے ہی کا کیا تھا اور ایک مدّت تک اس دعوے پر قائم رہے، مگر سفرِ حج کے دوران میں ان پر اپنے دعوے کی غلطی کا انکشاف ہوا اور وہ اس سے باز آ گئے۔ جو مرید آپ کے ہمراہ تھے انہیں اپنے المہدی ہونے کے اعتقاد سے پھیر دیا اور کہا کہ جب اس سفر سے واپس پلٹوں گا، تو باقی مریدوں کو بھی حقیقتِ حال سے آگاہ کر دوں گا، مگر پھر آپ کو وطن لوٹنا نصیب نہ ہوا۔ اثنائے راہ ہی میں اپنے اللہ سے جا ملے۔ آپ کے ہمراہیوں نے یہ خبر دوسروں تک پہنچائی۔ بعضوں نے تسلیم کر لیا اور بعض پرانے عقیدے ہی پر جمے رہے۔ بہرحال سیّد محمّد جونپوری کی طرف سے دعوئ المہدویت کے انتساب کو درست تسلیم کرنے کے باوجود ان کی تحریک ایک اسلامی تحریک تھی، لیکن بعد میں ان کے پیرو بیکار اور غلط قسم کے عقاید میں الجھ گئے اور اس نے ایک جدید مذہب "مہدویت"

کی صورت اختیار کر لی۔

مُلا عبداللہ سلطانپوری کے زمانۂ اقتدار میں سید محمد جونپوریؒ کا تو انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے خلفاء اور مرید ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہ لوگ کتاب و سُنّت کے متبع اور خادم، اظہارِ حق میں بے باک، زاہد و متورّع، صبر و رضا کے پیکر اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں تیغِ برہنہ تھے اور اس باب میں اس ارشادِ رسولؐ کے قائل کہ جو کوئی امرِ منکر کو دیکھے تو اُسے چاہیئے وہ اسے ہاتھ سے مٹا دے اور اگر ہاتھ سے مٹانے کی قوّت نہ ہو تو زبان سے اس کے خلاف جہاد کرے۔ منکر کو محض دل میں برا سمجھنے کو وہ ایمان کی کمزوری سمجھتے تھے۔ شیخ عبداللہ نیازی اور شیخ علائی اس تحریک کے نمایاں افراد میں سے تھے۔ یہ حضرات جہاں جاتے ہے، دنیا ان کی طرف کھنچی چلی آتی۔ عوام اور خواص میں سے جس تک ان کی دعوت پہنچتی، متاثّر ہو جاتا اور ان کے حلقے میں شامل ہو جاتا۔ مُلّا عبداللہ سلطانپوری ان سے خار کھاتے تھے۔ آخر سلیم شاہ کو ان کے خلاف اکسا کر انہیں اپنا تیغِ جفا جُو کا چارہ بنا لیا۔

ایک طرف تحفّظِ شریعت کے نام پر ظلم و تشدّد کا یہ عالم، دوسری جانب عمل و کردار کی یہ کیفیت کہ دنیا پرستی اور بندگیٔ اہواء ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ ساز و سرود کے رسیا تھے۔ شیخ علائی کو جب مُلّا صاحب کے کہنے پر سلیم شاہ نے اپنے دربار میں طلب کیا اور مسئلہ مہدویت پر بحث ہوئی تو مُلا عبداللہ سلطانپوری نے بھی اعتراضات کئے۔ اس پر شیخ نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا اور برملا کہا کہ —— "تو دنیا دار فاسق ہے، دائرۂ عدل سے باہر ہے، علانیہ تیرے گھر سے گانے بجانے کی آواز آتی ہے"۔ مُلّا صاحب نے استطاعت حج کا بھی فتویٰ دے دیا تھا۔ تاکہ خود انہیں سفرِ حج کی صعوبت نہ اٹھانی پڑے۔ جب انتقال ہوا تو ان کے ذاتی خزانے سے تین کروڑ روپے نکلے۔ انہوں نے اپنے خاندانی قبرستان میں سونے کی اینٹوں سے بھرے ہوئے صندوق دفن کرا رکھے تھے اور مشہور کر رکھا تھا کہ یہ ان

کے اجداد کی قبریں ہیں۔ اس کے علاوہ جو مال انھوں نے لوگوں کے پاس رکھ چھوڑا تھا۔ اس کی مقدار تو بقول بدایونی اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے مُلّا صاحب جس حیلے سے کام لیتے تھے اس کا ذکر کتاب کے پہلے حصے میں کیا جا چکا ہے۔

۲۱۔ عبدالقادر بدایونی

منتخب التّواریخ کے مصنّف۔ بساور میں پیدا ہوئے۔ مختلف علوم مختلف اساتذہ سے حاصل کئے، جن میں میر سید محمّد مکّی، شیخ حاتم سنبھلی اور شیخ مبارک ناگوری نمایاں ہیں۔ ۹۸۱ھ میں شاہی دربار سے وابستہ ہوئے۔ عربی، فارسی، سنسکرت، قرآن و حدیث اور تاریخ کے جلیل القادر عالم تھے۔ آواز بڑی دلکش اور شیریں تھی، اس لیے شروع میں امام بھی مقرر ہوئے۔ شاہی دربار میں جلال الدّین تورجی اور حکیم عین الملک کی وساطت سے باریاب ہوئے۔ بادشاہ ان کے علم وفضل سے خاصا متاثر ہوا اور کہا: "یہ بدایونی عالم حاجی ابراہیم سرہندی کی خوب سرکوبی کرے گا"۔ مُلّا صاحب کو بادشاہ نے تصنیف و ترجمہ کے کام پر مامور کیا۔ مُلّا صاحب نے سنسکرت اور عربی سے کئی کتابوں کے ترجمے کئے۔ علاوہ بریں متعدد تاریخی کتابیں لکھیں، مگر جس کتاب نے انہیں تاریخ اور تذکروں میں جگہ دی، وہ منتخب التّواریخ ہے۔ ایلیٹ نے اس کتاب کے متعلّق لکھا ہے:

> "بہت کم ایسے واقعہ نگار ہیں، جو بدایونی کی طرح اپنے جذبات کا اظہار کرنا جانتے ہیں۔ خصوصاً جو شاہی کانوں کو ناگوار ہوں اور جو اپنی غلطیوں اور لغزشوں کو اس وضاحت اور بے توجّہی کے ساتھ آشکارا کر دیتے ہوں"۔

مُلّا صاحب نے یہ کتاب اپنی زندگی میں پوشیدہ رکھی۔ جہانگیر کے زمانے میں اس کا چرچا ہوا تو اس نے ان کے بچّوں کو بلا کر سخت بازپرس کی، مگر ان کا موقف یہ تھا: "ہم تو اس وقت چھوٹے تھے، ہمیں اس کتاب کی خبر بھی نہیں ہے"۔ آخر بڑی مشکلوں

سے اس ضمانت پر رہا ہوئے کہ "اگر یہ ہمارے ہاں پائی گئی تو ہم سزا کے سزاوار ہوں گے۔" جہانگیر نے اس کتاب کی اشاعت اور پاس رکھنے کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔

بختاور خاں عالمگیری مرآۃ العلم میں لکھتا ہے:

"ملا عبدالقادر عقلی و نقلی دونوں قسم کے علوم کے فاضل تھے۔ فضیلتِ علمی کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کے انشاء پرداز تھے۔ نجوم، حساب اور ولایتی و ہندی راگ راگنیوں میں بھی مرتبۂ کمال رکھتے تھے۔ ذوقِ شعر بھی پایا تھا اور تخلص قادری تھا۔"

ملا کو تاریخ گوئی میں بھی بڑی دسترس تھی۔

۲۲- شیخ عبدالقدوس گنگوہی

شیخ عبدالقدوس صابریہ سلسلہ کے بڑے پایہ کے بزرگ شمار ہوتے ہیں۔ ابتدا میں رودولی میں رہتے تھے، لیکن جب ان اطراف میں کفار کا غلبہ ہوگیا اور شعائرِ اسلامی کی بے حرمتی اور بیخ کنی ہونے لگی تو شیخ وہاں سے چلے آئے، خاصی مدت شاہ آباد میں رہے، پھر وہاں سے گنگوہ منتقل ہوگئے۔ یہیں ۹۴۵ھ میں وفات پائی۔

شیخ نہایت متقی اور متبعِ شریعت تھے۔ مشتبہ امور سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ بے نمازی قصابوں کے ہاتھ کا ذبیحہ نہیں کھاتے تھے۔ شیخ انفرادی دینداری اور تقویٰ شعاری ہی کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اجتماعی زندگی کو بھی صالح قدروں سے ہم آہنگ دیکھنے کے متمنی تھے۔ اس مقصد کے لیے اپنے عہد کے سلاطین کو پند و نصیحت کرتے رہتے تھے۔ لودھی بادشاہوں نے شعائرِ اسلام کو از سرِ نو زندہ اور کفار کی چیرہ دستیوں کو ختم کیا تھا۔ اس لیے شیخ کو ان کے ساتھ خصوصی لگاؤ تھا۔ وہ بھی ان کے عقیدت مند تھے۔ ایک مرتبہ سکندر لودھی کو ایک مکتوب میں رعایا کے ساتھ عدل و انصاف کے ساتھ پیش

آنے کی تلقین کی اور لکھا کہ ایک ساعت کا عدل ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر اور فزوں تر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے قیامت کے دن اللہ کے نزدیک محبوب ترین شخص امام عادل ہو گا۔ اس لیے کہ اس کے عدل سے اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق بہرہ یاب ہوئی، چنانچہ وہ ان سات آدمیوں میں شامل ہو گا جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سائے میں اس روز جگہ دے گا جب اس سائے کے علاوہ کوئی دوسرا سایہ نہ ہو گا۔

جب مغلوں کی حکومت قائم ہوئی تو بابر اور ہمایوں کو بھی اسی نوعیت کی تلقین اور ترویج شریعت پر آمادہ کرتے رہے۔ بابر کو ایک مکتوب میں لکھا:

"عالی ظرف اصحاب دنیا کو آخرت کی کھیتی سمجھتے ہیں۔ ان کا ہر فعل خدا ہی کے لیے ہوتا ہے۔ احکام الٰہی کی عظمت، مخلوق خدا کے ساتھ شفقت اور نرمی سے پیش آنے سے وابستہ ہے اور اسی پر عمل پیرا ہونے سے ابدی فلاح حاصل ہوتی ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ منعم حقیقی کی نعمت کا شکرہ ادا کرنے کی خاطر لوگوں کے سروں پر عدل کا سایہ اس طرح قائم کریں کہ کوئی شخص کسی پر ظلم نہ کرے۔ ساری مخلوق اور لشکر و سپاہ کو شریعت کے اوامر و نواہی کا پابند بنائیں۔ باجماعت نماز ادا کریں اور علما کے علم کو دوست رکھیں۔ ہر شہر کے بازار میں محتسب گھومتے پھرتے رہیں تاکہ شہر اور بازار شریعت محمدی کے جمال عدل سے آراستہ اور روشن و منور ہو جائیں۔"

تاہم شیخ جب وحدت الوجود کے قائل ہوئے، تو اسے ایمان و شریعت کا تقاضا اور اس کے منکر کو بدعقیدہ قرار دینے لگے۔ ایک مرتبہ ان کے صاحبزادوں نے عرض کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور سنت میں تو اس کا ذکر نہیں ملتا اور ہم نے اسے جزو ایمان و عقیدہ بنا رکھا ہے، کہیں ایسا نہ ہو قیامت کے روز ہم سے مواخذہ کیا جائے۔ شیخ نے پہلے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی، مگر جب وہ ان کے دلائل سے مطمئن نہ ہوئے

تو سخت ناراض ہو گئے، شیخ کے نزدیک ان کے صاحبزادے وحدت الوجود کا منکر ہونے کی بنا پر علمِ معرفت میں بھی ناقص تھے۔ اس لیے انھوں نے ان سے قطعِ تعلّق کر کے گنگوہ چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ گنگوہ تو نہ چھوڑ سکے؛ البتّہ ان کے پیچھے نماز پڑھنا چھوڑ دی۔ حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے والد شیخ عبدالاحدؒ شیخ کے خلفا میں سے تھے۔

۲۳۔ شیخ عبدالنّبی صدر الصّدور

شیخ عبدالقدّوس گنگوہیؒ کے پوتے تھے۔ مشائخ کے مشہور خاندان سے تعلق تھا۔ اور امام ابو حنیفہؒ کی اولاد سے تھے۔ علمِ حدیث کی تحصیل مکّہ معظمہ اور مدینہ منوّرہ میں کی۔ تحصیلِ علم کے بعد وطن آئے، تو علومِ دینی کی تدریس میں مشغول ہو گئے اور بزرگوں کے صوفیانہ مسلک کو ترک کر دیا۔ شیخ سماع کے بھی منکر تھے اور اس موضوع پر ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔ محدّثین کے طریقے پر عمل کرتے تھے۔ متّقی، پاکباز اور عابد و زاہد تھے۔ جن دنوں مظفّر خاں وزیرِ کُل تھا، شیخ دربار میں پہنچے اور اس کی سفارش پر صدر الصّدور کا منصب تفویض ہوا۔ صدر الصّدور منصب میں وکیل السّلطنت، میر بخشی اور میر سامان کے ہم پایہ ہوتا تھا۔ علماء کی سرگرمیوں کی نگرانی، درس و تدریس کی دیکھ بھال، عوام النّاس کی مذہبی، تعلیمی اور اخلاقی حالت کا احتساب صدر الصّدور ہی کے سپرد ہوتا۔ قاضیوں اور مفتیوں کا تقرّر بھی وہی کرتا۔ شرعی قوانین کے نفاذ کی ذمّہ داری بھی اسی کی تھی۔

شیخ عبدالنّبی کے تقرّر میں ایک اہم مصلحت کارفرما تھی۔ مخدوم الملک عبداللّٰہ سلطان پوری سُوریوں کے زمانے سے پہلے سے ایک اہم مقتدر مذہبی شخصیت تصوّر کیے جاتے تھے۔ مغلوں کی حکومت قائم ہوئی، تو ان کے اثر و رسوخ میں اَور اضافہ ہو گیا۔ شیخ الاسلام بن جانے سے ان کی ذات سلطنت کے دینی عناصر کی قوّت کی علامت بن گئی۔ ان کے اس اثر کو گھٹانے کے لیے شیخ عبدالنّبی کو آگے لایا گیا۔ اس طرح مخدوم الملک اور

صدر الصدور میں رقابت کی جنگ چھڑ گئی اور ایک دوسرے کو گرانے کی فکر میں رہنے لگے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اوچھے سے اوچھا حربہ استعمال کیا۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالا، ایک دوسرے کو جاہل قرار دیا۔ اکبر کی گمراہی اور الحاد اور دین سے بیزاری میں ان دونوں کے کردار اور ان کی رقیبانہ کشمکش کا بڑا ہاتھ ہے۔

اکبر ابتدا میں شیخ کا بے حد معتقد تھا۔ اکثر حدیث کے سماع کے لیے ان کے گھر حاضری دیتا تھا۔ ان کی جوتیاں تک اس نے سیدھی کیں۔ بڑے شہزادے کو بھی تعلیم کے لیے انھی کے پاس بٹھایا۔ ایک مرتبہ شیخ نے اکبر کو سرِ دربار مار بھی۔ اکبر نے سالگرہ کی تقریب میں اپنے کپڑوں پر زعفرانی رنگ چھڑکا۔ شیخ سخت چراغ پا ہو گئے اور اپنا عصا دے مارا۔ اکبر نے محل میں جا کر ماں سے شکایت کی کہ شیخ خلوت میں منع کرتے، تو کوئی ہرج نہ تھا۔ سرِ دربار ذلیل نہ کرتے۔ ماں نے سمجھایا کہ بیٹا بُرا نہ مانو، یہ نجاتِ اخروی کا باعث ہے۔ قیامت تک چرچا رہے گا کہ ایک مفلوک الحال مُلّا نے بادشاہ کے ساتھ ایسی گستاخی کی اور سعادت مند بادشاہ نے اسے برداشت کیا۔

شیخ نے اپنے فرائض جس طرح سے انجام دیئے اس کا مختصر ذکر کتاب کے پہلے حصے میں ہو چکا ہے۔ مخدوم الملک اور شیخ کی باہمی کشمکش کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا وقار بادشاہ کی نظر میں تدریج کم ہوتا چلا گیا۔ فیضی اور ابوالفضل دربار میں آئے اور انھوں نے بادشاہ کو الحاد کی طرف مائل کیا، تو رہا سہا وقار بھی جاتا رہا۔ متھرا کے دریدہ دہن برہمن کے واقعۂ قتل پر ہندو بیویوں اور امراء نے بادشاہ کو اکسایا اور اسے "غیرت" دلائی کہ ان مُلّاؤں کے حوصلے اب اتنے بڑھ گئے ہیں کہ آپ کی مرضی و پسند کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور آپ کے حکم کے بغیر محض اپنی سطوت و اختیارات کا سکہ جمانے کے لیے لوگوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ اسی روز سے شیخ کا زوال شروع ہو گیا۔ محضر نامے پر ان سے بجبر دستخط کروائے گئے۔ پھر انہیں حج کے بہانے مکّہ معظّمہ کی طرف جلا وطن کر دیا گیا۔ ملک میں شورش

برپا ہونے کی خبر سن کر شیخ اور مخدوم الملک دونوں واپس چلے آئے - مخدوم الملک تو جلد ہی فوت ہو گئے - شیخ فتح پور بلوائے گئے - اکبر سے رُو در رُو سخت باتیں ہوئیں - اکبر نے سرِ دربار ان کے منہ پر تھپّڑ مارا اور پھر راجہ ٹوڈر مل کے حوالے کر دیا کہ اس سے ستر ہزار روپے کا حساب لیا جائے جو مکّہ معظّمہ جاتے وقت انہیں دیا گیا تھا - ایک مدّت تک حوالات میں قید رہے اور پھر قید ہی کی حالت میں ان کا گلا گھونٹ کر انہیں قیدِ حیات سے رہائی دے دی گئی - معتمد خان نے اقبال نامے میں صاف لکھا ہے کہ شیخ کو بادشاہ کے اشارے پر ابوالفضل نے مروا ڈالا - مُلّا عبدالقادر لکھتے ہیں :

"جائے عبرت ہے شیخ عبدالنّبی جیسے مقتدر آدمی کا یہ انجام ہوا کہ قتل کے دوسرے دن مناروں والے میدان میں اس کی لاش ظہر کی نماز تک بے گور و کفن پڑی رہی"

ستم ظریفوں نے شیخ کو مرنے کے بعد بھی معاف نہ کیا - شیخ کی تاریخِ وفات "شیخِ کبنی" یعنی شیخِ بھنگ نوش نکالی گئی -

گرچہ الشیخ کالنّبی گفتند
کالنّبی نیست شیخِ ما کبنی است

غ

۴۷- امام غزالیؒ

محمدؐ نام، ابو حامد کنیت، حجتہ الاسلام لقب، غزالی عرف۔ ۴۵۰ھ میں ضلع طوس میں طہران میں پیدا ہوئے۔ پہلے اپنے وطن میں تعلیم پائی۔ کچھ مدت جرجان میں رہے اور امام ابو نصر اسمٰعیلی سے پڑھا۔ پھر نیشا پور چلے گئے اور امام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک الجوینیؒ الشافعی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ امام الحرمین اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم تھے۔ نیشا پور کے خطیب، اوقافِ اسلامی کے ناظم اور مدرسۂ نظامیہ کے صدر مدرس تھے۔ ابنِ خلکان کے الفاظ میں: علمی و دینی میدان میں ان کا کوئی حریف نہ تھا، محراب و منبر کی زینت تھے، خطابت، تدریس اور جمعہ کے وعظ و تذکیر میں ان کی عظمت مسلّمہ تھی۔ امام الحرمین اپنے اس باکمال شاگرد پر بے حد نازاں تھے اور انہیں اپنا نائب بنا لیا تھا۔ فرمایا کرتے: غزالی علم کا بحرِ ذخّار ہے۔ استاد کے انتقال کے بعد نیشا پور سے نکلے۔ اس وقت آپ ۲۸ برس کے تھے۔ اتنی چھوٹی عمر کے باوجود بلادِ اسلامی کے چیدہ باکمال اصحابِ علم و فضل میں شمار ہوتا تھا۔ درس و تدریس سے فارغ ہو کر ملک شاہ سلجوقی کے وزیر نظام الملک کے دربار میں پہنچے جو ان دنوں اہلِ علم و کمال کا مرجع و ماویٰ تھا۔ نظام الملک ان کے علم و فضل سے بے حد متاثر ہوا اور انہیں عالمِ اسلام کی سب سے بڑی درس گاہ نظامیہ کی صدارت تفویض کی۔ یہ اس دور کا سب سے اونچا علمی اعزاز تھا۔ بغداد علم و فضل کا مرکز تھا۔ امام غزالی جلد ہی علمی حلقوں کے مرکزِ توجہ بن گئے۔ ان کے علمی تبحر کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ تشنگانِ علم ہر طرف سے آپ کے حلقۂ درس میں شریک ہونے کے لیے بغداد کا رخ کرنے لگے۔ امام کا مرتبہ اپنے عہد کے بڑے

بڑے ارکان و اعیانِ سلطنت سے کم نہ تھا۔ خلیفہ مقتدی باللہ کی طرف سے انہوں نے سفارت کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔

امام غزالی کا دور فلسفہ و تعقّل پرستی کا دور تھا۔ یونانی فلسفیوں خصوصاً ارسطو کی تصنیفات، جو عربی میں منتقل ہو چکی تھیں مسلمانوں کے فکر و ذہن کو بری طرح متاثر کر رہی تھیں۔ فلسفیانہ موشگافیوں سے دین و شریعت اور اصول و عقائد کوئی چیز محفوظ نہ رہی تھی۔ دینی اصطلاحات کو نئے نئے معانی پہنائے جا رہے تھے۔ آیاتِ قرآنی کی نئی نئی تعبیریں کی جا رہی تھیں۔ دوسری طرف باطنیت کا فتنہ عروج پر تھا، جس نے فلسفے کی آوارہ خیالی، لذتیت پرستی اور رفض و تشیّع کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ باطنیوں کے ہاتھ سے عالمِ اسلام کا کوئی دینی و سیاسی رہنما اور عالم و صالح شخص ہی محفوظ نہ تھا، بلکہ وہ مسلمانوں کے فکر و عقیدہ کو سبوتاژ کرنے کے لیے ایک نیا علمِ کلام اور دین و شریعت کی نئی تعبیرات بھی پیش کر رہے تھے جو فلسفیوں کی خیال آرائیوں اور تعبیرات سے کہیں زیادہ خطرناک تھیں۔ فلسفہ و باطنیت کی ان دو بلاؤں کے درمیان مسلمان ذہنی انتشار میں مبتلا حیران پریشان کھڑے تھے۔ مسلمانوں کے دانشور طبقے کے ایک بڑے عنصر کا رجحان فلسفے کی طرف تھا۔ باطنیت سے دانشوروں سے زیادہ خوش عقیدہ عوام الناس اور عام پڑھا لکھا عنصر مرعوب و متاثر تھا۔ امام غزالی ابتدا میں خود فلسفے اور تعقّل پرستی کے والہ و شیدا تھے، لیکن پھر شک و ریب نے بے اطمینانی پیدا کر دی جو بڑھتے بڑھتے تفلسف کی اس زندگی سے بیزاری کا موجب بن گئی۔ اس بیزاری نے انہیں تحقیقی مطالعے پر راغب کیا۔ مطالعے کا یہ دور ایک سال کی مدّت پر محیط تھا۔ اس مطالعے سے ان پر فلسفے کی نامحکمی اور عقلیات کی بے مائیگی آشکارا ہو گئی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ فلسفہ اپنے دامن میں قلب و ذہن کی تشفّی کا کوئی سامان نہیں رکھتا۔ اس کی بنیاد پر قائم ہونے والی افکار و نظریات کی عمارت، سطح بینوں اور کوتاہ فہموں کو چاہے کتنی ہی خوشنما اور پختہ و مستحکم نظر آئے، سخت بے تمکین ہے۔ حقیقی علم وہ ہے جو کتاب و سُنّت

کے صاف و شفّاف چشمے سے حاصل ہوتا ہے۔ پھر تصوّف کے کوچے میں پہنچے۔ ابو طالب مکّی، حارث محاسبی، جنید، شبلی اور بایزید بسطامی وغیرہ اجل صوفیا کے ملفوظات اور تصنیفات کا مطالعہ کیا اور آخر جاہ و اقبال، علم و تعلّم اور عزّت و شہرت کی زندگی کو لات مار کر بغداد سے نکل کھڑے ہوئے۔ گیارہ برس تک دمشق، بیت المقدس، مکّہ معظّمہ، مدینہ منوّرہ اور اپنے وطن میں سخت مجاہدے اور ریاض کی زندگی گذاری، شک و ریب اور بے اطمینانی کے کانٹے نکل گئے، دلجمعی اور سکونِ قلب میسّر آیا، مگر انہوں نے خلوت و عزلت گزینی ہی پر اکتفا نہ کیا۔ انہیں مسلمانوں کے ہر طبقے کی فکری و عملی خرابیوں اور گمراہیوں سے آشنا ہونے کا موقع ملا تھا۔ فلسفہ زدگی، متصوّفین کی گمراہی، علماء کی بے علمی اور متکلّمین کی بے تمکینی سے اکثر طبقات کا ایمان متزلزل اور عقائد متاثّر ہو چکے تھے۔ ان خرابیوں اور کمزوریوں کے حقیقی اسباب و عوامل پر ان کی گہری مشاہداتی اور تجرباتی نظر تھی۔ پھر امام مختلف علوم کے وسیع ہمہ پہلو مطالعے اور کتاب و سُنّت سے گہری واقفیت کی بدولت یہ بجا طور پر محسوس کر رہے تھے کہ وہ مسلمانوں کے ان فکری و عملی امراض اور عقیدہ و اخلاق کی خرابیوں کا مداوا کرنے کی استطاعت و اہلیت سے بہرہ ور ہیں؛ تاہم انہیں یہ بھی احساس تھا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ـــــ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے۔ سارے زمانے کی مخالفت اور عداوت کا سامنا کرنا پڑے گا، لیکن انہیں اپنے سوا کوئی اور مردِ میدان نظر نہیں آ رہا تھا۔ مرض وبا کی صورت اختیار کر گیا تھا اور مسیحا خود بیمار تھے۔ ایک طرف کٹھن کام اور اس راہ میں مشکلات اور صعوبتوں کا تصوّر اور عزلت گزینی سے محبّت و انس دامن گیر تھا۔ دوسری جانب احساسِ فرض انہیں میدان میں نکلنے کی دعوت دے رہا تھا۔ ابھی وہ شش و پنج میں تھے کہ نیشاپور سے سلطان کا بلاوا پہنچا۔ یہ گویا اشارۂ غیب تھا۔ امام خلوت و عزلت ترک کر کے پھر میدانِ علم و عمل میں پہنچ گئے۔

گیارہ برس کے بعد غزالی پھر مدرسۂ نظامیہ میں زینت آرائے مسندِ درس تھے، مگر

اس غزالی اور گیارہ برس پہلے کے غزالی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ گیارہ برس پہلے کے غزالی محض ایک فلسفی، مناظر اور جاہ و عزّت کے طلبگار صاحبِ علم تھے جن کے سامنے متکلمانہ موشگافیوں، فلسفیانہ مباحث، مناظروں اور بے رُوح درس و تدریس کے سوا اَور کوئی مقصد نہ تھا۔ اب وہ ایک مصلحِ مجدّد اور انقلابی غزالی تھے۔ اُمّت کے طبیب اور مسیحا، جن کا ہاتھ امت کی نبض پر تھا۔ جس کے امراض کے مداوا کی فکر انہیں مضطرب اور بے قرار کئے دیتی تھی۔ درس و تدریس کا شغل تھا یا تالیف و تصنیف کا سلسلہ، مقصود صرف ایک تھا۔ اصلاحِ فکر و کردار! وہ خود "المنقذ من الضلال" میں لکھتے ہیں:

"میری پہلی اور موجودہ حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلے میں حصول جاہ کی خاطر علم کی نشر و اشاعت کیا کرتا تھا۔ یہی میرے قول و عمل کا مقصود تھا، لیکن اب میں اس علم کی طرف بلاتا ہوں جس کی بدولت جاہ کو تج دینا پڑتا ہے۔ اب میں اپنی اور دوسروں کی اصلاح کا خواہاں ہوں"۔

اب امام غزالیؒ کی ساری جدّ و جہد فلسفہ اور باطنیت کی فتنہ آرائیوں کے سدِّباب، اور اسلامی معاشرہ کی فکری و عملی غلط کاریوں پر تنقید اور اس کی اصلاح پر مرکوز تھی۔ انہوں نے ایک طرف فلسفہ کی کمزوریوں کو آشکارا کیا اور استدلال کی قوّت سے اس کی بے مائیگی ثابت کی۔ اس طرح فلسفے کے اس رعب و طلسم کو توڑا جس کا دانشور طبقہ اسیر ہو چکا تھا۔ دوسری طرف باطنیت کی فکری بنیادوں پر ضربِ کاری لگائی۔ تیسری طرف مسلمان معاشرے کے ایک ایک طبقے پر کڑی تنقید کی اور ان اسباب و عوامل کی نشان دہی کی جو مسلمانوں کے دینی و اخلاقی انحطاط کے پیچھے کار فرما تھے۔ ان کے نزدیک مسلمان معاشرے میں پھیلی ہوئی دینی اور اخلاقی خرابیوں کے سب سے بڑے ذمّہ دار حکمران اور علماء تھے۔ انہوں نے ان دونوں طبقات پر کڑی نکتہ چینی کی۔

خصوصاً علماؒ کی کمزوریوں اور ذمّہ داریوں پر سیر حاصل تنقید و تبصرہ کیا۔ مزید برآں دولت مندوں اور عوام النّاس کے کردار و اعمال کا جائزہ لیا۔ اس طرح پورے نظام اجتماعی کے مفاسد، کمزوریوں اور امراض کی نشاندہی کی اور اس میں نہ کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا کی اور نہ کسی مصلحت اور خوف کو خاطر میں لائے۔ فی الواقع یہ اس دور میں اتنا عظیم الشّان کام تھا کہ امام غزالیؒ ہی کو زیب دیتا تھا۔ امام غزالیؒ کے علم، ان کی بصیرت اور ان کے کام کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے ان کی کتاب "احیاءِ علوم الدّین" کا مطالعہ کافی ہے جسے یورپ کے اہلِ علم تک نے خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔ یہ کتاب عقائد و فقہ، تزکیۂ نفس اور تہذیبِ اخلاق اور احسان (تصوّف) کے موضوعات سے بحث کرتی ہے اور بلاشبہ اسلامی علوم کی ایک مختصر انسائیکلوپیڈیا ہے اور حق کے طلبگار کو بس کرتی ہے۔ بایں ہمہ اس میں کمال کی تاثیر ہے۔ مولانا شبلی نے "الغزالی" میں اس کتاب کے اس پہلو کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"احیاء العلوم میں یہ عام خصوصیت ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر عجیب اثر ہوتا ہے، ہر فقرہ نشتر کی طرح دل میں چبھ جاتا ہے۔ ہر بات جادو کی طرح تاثیر رکھتی ہے، ہر لفظ پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ کتاب جس زمانے میں لکھی گئی، خود امام صاحب تاثیر کے نشے میں سرشار تھے۔"

امام غزالیؒ دوسری مرتبہ مدرسۂ نظامیہ میں تھوڑی مدّت ہی رہے۔ پھر اپنے وطن طوس چلے گئے اور وہاں ایک مدرسہ و خانقاہ کی بنیاد ڈالی جہاں تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے۔ آخر طہران میں ۵۰۵ھ میں پچپن سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

امام غزالیؒ ائمہ و صلحاؒ کی طرح زاہد و متورّع تھے۔ بڑے بے باک اور حق گو تھے۔ انہوں نے سلاطین پر اور ان کے قائم کردہ نظامِ حکومت پر اپنی کتابوں ہی میں تنقید نہیں کی، بلکہ جب بھی موقع ملا حکمرانوں کے رُو در رُو حق بات کہنے سے گریز نہیں کیا۔

ملک شاہ سلجوقی کے بیٹے سلطان سنجر سے ملاقات ہوئی، تو بھرے دربار میں اس سے کہا:

" افسوس کہ مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکالیف سے ٹوٹی جاتی ہیں اور تیرے گھوڑوں کی گردنیں طوقہائے زرّیں کے بار سے۔"

ف

۲۵- شیخ فرید بخاری

بخارا کے رہنے والے تھے۔ پورا نام فریدالدین تھا۔ عہدِ اکبری میں میر بخشی کے منصب پر فائز تھے۔ اکبر کی زندگی کے آخری سالوں میں ان کا اقتدار بہت بڑھ گیا۔ اور نائب دیوان (نائب وزیرِ اعظم) بن گئے ــــ محکمۂ مالیات کا شعبۂ تنخواہ ان کے ذمّے تھا۔ جہانگیر کی تخت نشینی میں شیخ فرید کا بڑا ہاتھ تھا، اس لیے جہانگیر کے عہد میں ان کا مرتبہ و مقام بہت زیادہ بلند ہو گیا۔ خسرو کی بغاوت فرو کرنے کے صلے میں جہانگیر نے انہیں نواب مرتضیٰ خاں کا خطاب، پنج ہزاری منصب اور نقّارہ و عَلَم اور اسپ مع ساز و کمر بند مرصّع عطا کیا۔ جہانگیر اپنی توزک میں ان کے متعلق لکھتا ہے:

"شیخ فرید میرے باپ کے عہد میں میر بخشی تھا۔ میں نے ۱۲ محرم ۱۰۱۵ھ کو اسے پنجاب کا جو تمام ممالکِ محروسہ میں سب سے بڑا صوبہ ہے، صوبہ دار مقرر کیا اور شال خاصہ عنایت کی"۔

کارنامۂ جہانگیری میں لکھا ہے کہ جہانگیر نے انہیں خلعت و شمشیرِ مرصّع اور دوات و قلم مرصّع عنایت کرنے کے علاوہ صاحب السّیف والقلم بھی قرار دیا۔ شیخ تیغ و قلم دونوں کے دھنی بھی تھے، علم انہیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملا تھا اور تلوار ان کے گھرانے نے بساطِ مشیخت بچھا کر سرکار دربار سے مددِ معاش حاصل کرنے کو ترک کر کے اختیار کی تھی۔ شیخ نے پہلے اکبر اور پھر جہانگیر کے عہد میں مختلف جنگی مہموں میں ــــ اپنی تلوار کے جوہر دکھائے۔ حمیتِ دین میں نہایت گرم جوش تھے، اکبری الحاد اور بے دینی کی لائی ہوئی گمراہیوں کو ختم کرنے کے لیے حضرت مجددؒ نے اصلاح و تجدید

کی جو جِدّوجہد کی، اس میں شیخ نے سب سے زیادہ حِصّہ لیا۔ اسی کے اصرار پر جہانگیر نے تختِ نشین ہونے کے بعد حکم جاری کیا کہ ملکی معاملات میں کسی خلافِ شرع فعل کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ شریعتِ حقّہ کی ترویج واشاعت اور نفاذ واستحکام ان کی سب سے بڑی فکر تھی۔

شیخ مجموعۂ کمالات واوصاف تھے۔ نیک اور متدیّن، جودوسخا کے پیکر۔ نیک کاموں میں دل کھول کر حصّہ لیتے ـــــ گھر سے نکلتے تو راستے میں مسکینوں کو کمبل، چادر اور کپڑے تقسیم کرتے جاتے۔ کسی کو نقد روپیہ اور کسی کو اشرفی دیتے، بیواؤں اور محتاجوں کے لیے یومیہ، ماہانہ اور سالانہ وظیفے مقرّر تھے۔ غریب لڑکیوں کی شادی اور ان کے جہیز کا سامان کرتے۔ ان کے دستر خوان پر روزانہ پانچ سو سے ایک ہزار تک آدمی کھانا کھاتے تھے۔ کاروان سرائے اور عمارات تعمیر کراتے۔ مآثر الامراء میں ہے:

"شیخ کا ظاہر و باطن آراستہ و پیراستہ تھا۔ شجاعت اور سخاوت ان کی ذات میں جمع ہو گئی تھی۔ خلقِ خدا کے لیے ان کا فیض اور بخشش عام تھی۔ جو بھی ان کی خدمت میں پہنچتا، ناکام نہ لوٹتا۔"

اقبال نامہ جہانگیری کا مصنّف لکھتا ہے:

"شیخ کا ظاہر و باطن نہایت آراستہ اور سنجیدہ تھا۔ بزرگی اور دولت کو ان سے عزّت و شرف حاصل تھا نہ کہ انہیں بزرگی اور دولت سے۔ شجاعت اور سخاوت کا مجموعہ اور بذاتِ خود خیر تھے۔"

جہانگیر کے گیارہویں سال جلوس میں شیخ کو کانگڑہ کی مہم پر مامور کیا گیا۔ ابھی یہ مہم سر نہ ہو پائی تھی کہ شیخ کا انتقال ہو گیا۔ جہانگیر ان کی وفات پر لکھتا ہے:

"۲ ربیع الاوّل کو مجھے مرتضیٰ خاں کے انتقال کی خبر ملی۔ وہ میرے قدیم دوستوں میں سے تھا۔ میں نے اس کا منصب شش ہزار اور پنج ہزار

اسوارہ تک پہنچایا اور پنجاب کا ناظم مقرّر کیا تھا۔ مجھے اس کی غمناک خبر سے بہت صدمہ ہوا۔"

وفات کے بعد جب ان کا اثاثہ شمار کیا گیا تو ایک ہزار اشرفیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس مردِ سخی نے اپنا سب کچھ اپنی زندگی ہی میں حاجت مندوں پر خرچ کر دیا تھا۔ مآثرالامراء کا مصنّف شیخ کی خوبیوں اور فیاّضیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"شیخ کا ظاہر و باطن آراستہ تھا۔ شجاعت کے ساتھ سخاوت کے بھی حامل تھے۔ ان کی عام بخشش اور فیاّضی کا دروازہ لوگوں کے لیے کھلا تھا۔ جو بھی ان کے پاس پہنچ جاتا، اپنے آئینۂ خیال میں ناکامی کا چہرہ نہ دیکھتا...... خانقاہ کے لوگوں، توکّل پسندوں، محتاجوں اور بیواؤں کے لیے ان کے یہاں سے یومیہ اور سالانہ رقوم مقرّر تھیں۔ ان کی جاگیر اکثر و بیشتر مددِ معاش کے لیے تھی...... شراب فروشوں اور کلاونتوں کو کچھ نہ دیتے۔ کئی رباط اور سرائیں تعمیر کروائیں......

سبحان اللہ، شب و روز کی گردش اور انجم و کواکب کی رفتار وہی ہے لیکن ملک اور زمانہ ایسے لوگوں سے خالی ہو گیا ہے۔ شاید وہ کسی اور دنیا میں جا بسے ہیں"۔

۲۶۔ فیضی فیاّضی

شیخ مبارک کا بڑا بیٹا نہایت لائق اور ذہین و فطین تھا۔ بیس برس کی عمر میں اکبر کے دربار میں پہنچا اور نوعمری کے باوجود اپنے علم و فضل کی بدولت بادشاہ کا مقرّب بن گیا۔ پہلے چہار صدی منصب عطا ہوا۔ پھر تیس برس کی عمر میں ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ عربی، فارسی اور سنسکرت کا بلند پایہ عالم تھا۔ شعر، معمّاگوئی، عروض و قافیہ، تاریخ،

لغت، طب اور انشاء میں بے عدیل و بے مثل تھا۔ مختلف زبانوں میں ایک سو ایک کتابیں تالیف کیں پہلے فیضی تخلص کرتا تھا پھر فیاضی رکھ لیا۔ اس کا کلام تقریباً پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ فیضی کے قصائد، غزلوں اور مثنویوں کا شمار فارسی کی بہترین نظموں میں ہوتا ہے۔

اکبر کا محبوب دوست تھا اور ہمیشہ اپنے قریب رکھتا تھا۔ شاہزادوں کی تعلیم و تربیت عموماً اسی کے سپرد تھی۔ شہزادہ دانیال نے برزح بھاشا اسی سے سیکھی تھی۔ بعض فوجی مہموں میں بھی شرکت کی۔ خاندیس اور احمد نگر کے حکمرانوں کے پاس سفیر بن کر بھی گیا۔ ۹۹۷ھ میں اکبر کشمیر گیا تو فیضی بھی ان کے ہمراہ تھا۔ اسی موقعہ پر اس نے اپنا مشہور قصیدہ کہا تھا جس کا مطلع ہے:

ھزار قافلۂ شوق می کند شبگیر
کہ بارِ عیش کشاید بہ خطۂ کشمیر

نہایت آزاد منش اور آوارہ خیال تھا، اکبر کی آوارہ خیالی میں اس کا بڑا حصہ تھا۔ بدایونی اس کے علم و فضل کے معترف اور مداح ہیں، لیکن ساتھ ہی انہوں نے اس کی آوارہ فکری اور الحاد پرستی کی خوب خبر لی ہے۔ لکھتے ہیں:

"مسلمانوں سے اس کو قلبی عناد تھا۔ دین کی اہانت کرتا رہتا تھا۔ صحابۂ کرام رض متقدمین اور متاخرین اہلِ علم اور مشائخ زندہ یا مرحوم کی مذمت اور بے ادبی میں اسے کوئی باک نہ تھا۔ صالحین اور اہلِ علم و فضل کی توہین اس کے شب و روز کا شیوہ تھا۔ بدعقیدگی کا یہ عالم تھا کہ شریعت کی ضد میں حلال و فرائض کو حرام قرار دیتا تھا۔"

شیخ اکرام جنہوں نے فیضی کی پُر زور وکالت کی ہے، وہ بھی کم از کم اتنا تو تسلیم کرتے ہیں ......

"چونکہ فیضی کی آزاد روی معلوم تھی اور اس کے علاوہ وہ فقط شاعر ہی نہ تھا عالم بھی تھا، اس کی باتیں زیادہ کھٹکتی تھیں۔ بدایونی تو یقیناً اسے ملحد سمجھتا تھا اور شیخ عبدالحق محدثؒ اور دوسرے متقی بزرگ جب بہشت و دوزخ کے متعلق اس کے خیالات یا اسلام کے بعض مسلّمہ اصولوں پر اس کی نکتہ چینی دیکھتے، تو وہ بھی بدایونی سے متفق ہو جاتے"۔

اس کے بعد شیخ صاحب ایک بہت بڑے "لیکن" کے ساتھ فیضی کی صفائی پیش کرتے ہیں اور آخری عمر میں اس نے جو بے نقط تفسیر اور نل دمن کی مثنوی میں نعت لکھی تھی، اُسے اپنے دعوے کی دلیل بناتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے "ممکن ہے کہ بھٹک بھٹک کر اور "چابکِ تعقّل" اور تشکک کے نشتر کھانے کے بعد فیضی راہِ راست پر آ گیا ہو"۔ بے شک گمراہی اور ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے، تاریخ میں کتنے ہی ایسے لوگوں کے حالات ملتے ہیں جو پہلے ضالّ اور مضلّ تھے — لیکن اللہ کی توفیق سے خود بھی راہِ راست پر آ گئے اور خلقِ خدا کو بھی اس کی طرف بلایا، تاہم اگر وہ اصحابِ تصنیف تھے، تو انہوں نے اپنی گمراہی کا برملا اعتراف اور راہ یابی پر اللہ کا شکر ادا کیا، لیکن فیضی کی آخری عمر کی ان دونوں تصنیفات میں ایسا کوئی اشارہ تک نہیں ملتا، کیا اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ فیضی اپنی زندگی کے کسی دور میں کبھی گمراہ نہیں رہا تھا؟ خود شیخ اکرام اس کے قائل نہیں ہیں۔ اگر فیضی نے نل دمن کی نعت اور بے نقط تفسیر "نورِ ایمان" حاصل ہونے کے بعد لکھی تھی، تو اصل حقیقت کے اعتراف میں کون سا امر مانع رہا؟ اس اعتراف سے فیضی کی عظمت میں اضافہ ہی ہوتا۔

ہمارے نزدیک بے نقط تفسیر اور نل دمن کے نعتیہ اشعار پر فیضی کی راہ یابی کا قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ بے نقط تفسیر فیضی نے محض اپنی ذہنی اپج اور اپنے علم و فضل کے اظہار کے لیے لکھی تھی۔ اس سے مقصود کتاب اللہ کی تفسیر، اُس کے رموز و اسرار کی پردہ کشائی اور خلقِ خدا کی ہدایت ہوتی، تو فیضی کا اندازِ بیان بالکل مختلف ہوتا۔ بے نقط عبارت ایک شخص

کی ذہانت، لغت اور الفاظ پر قدرت اور ندرتِ فکر کا ایک حیران کن نمونہ تو ہو سکتی ہے، لیکن اسے کسی سنجیدہ ذہن کی سنجیدہ علمی کوشش قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اصل حقیقت یہ نظر آتی ہے کہ اکبر کے دربار میں جو علما و فضلائے روزگار جمع ہو گئے تھے، وہ اپنی علمیّت و فضیلت کے اظہار اور بادشاہ کی نظر میں مؤقر و محترم ٹھہرنے کے لیے عجیب و غریب طریقے اور نئے سے نیا انداز اختیار کرتے تھے۔ فیضی کی تفسیر اسی نوعیت کی ایک کوشش تھی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے فیضی اگر بدایونی کے الفاظ میں ملحد و زندیق تھا تو یہ تفسیر اس کے زندقہ والحاد سے کیوں خالی ہے؟ مولانا شبلی تک نے تسلیم کیا ہے کہ اس تفسیر کے آئینے میں فیضی ایک راسخ العقیدہ مسلمان نظر آتا ہے۔ اس کا سبب ہمارے نزدیک وہی ہے جو ہم نے ابوالفضل کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ یعنی یہ باپ بیٹے تاریخ کے شعور سے خوب آگاہ تھے۔ انہیں اس حقیقت کا پوری طرح احساس تھا کہ وہ اسلامی معاشرہ کے اندر جو کردار ادا کر رہے ہیں، تاریخ اسے اچھے الفاظ میں یاد نہیں کرے گی، اس لیے انہوں نے اپنے خیال میں پورا اہتمام برتا کہ مؤرّخ کو ان کی سیاہ کرداری کی کوئی شہادت ملنے نہ پائے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ ان کے ملحدانہ کردار کا عینی شاہد اپنے حجرے میں بیٹھا ایک ایسی دستاویز مرتب کر رہا ہے جس کے آئینے میں مستقبل کا مؤرّخ ان کے حقیقی خدوخال دیکھ سکے گا۔

بدایونی نے نلدمن کے نعتیہ اشعار کے متعلق لکھا ہے:

"موت سے پہلے اس نے لوگوں کے کہنے اور بڑے اصرار کے بعد حضور اکرمؐ کی معراج اور نعت میں چند شعر کہے اور نلدمن میں درج کر دیئے تھے"۔

شیخ اکرام صاحب ان نعتیہ اشعار کے متعلق شمس العلما آزاد کی رائے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"لیکن تفسیر[1] اور نلدمن کے متعلق تاویلیں لکھ دینے سے مُلّا صاحب کی سب

---

[1] - بدایونی فیضی کی اس بے نقط تفسیر کے متعلق رقمطراز ہیں: (اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

مشکلیں آسان نہیں ہو جاتیں۔ فیضی کے اشعار ہیں اور کئی چیزیں ہیں جو ان کے الزامات کی تردید کرتی ہیں، ان کا احسان ہے۔ ان سب کی تاویلیں نہیں کر گئے۔ نعت میں کئی پُر اثر رباعیات ہیں...... حمد کے مضامین کو تو فیضی — اس خلوص اور جوش سے ادا کرتا ہے کہ باید و شاید......"

تین چار رباعیات بطور مثال دینے کے بعد صاحبِ رودِ کوثر لکھتے ہیں:

"اب ناظرین فیصلہ کر سکتے ہیں کہ بدایونی کے بیان کو حرف بحرف صحیح مانا جائے یا فیضی کے ان اشعار پر زیادہ اعتماد کیا جائے جو اس کے دل کے ٹکڑے اور اس کے نہاں خانۂ دماغ کی تحقیق ہیں۔"

کسی شاعر کی حمدیہ رباعیات اور نعتیہ اشعار کی بنیاد پر اس کے راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کا دعویٰ عجیب ہی نہیں مضحکہ خیز بھی ہے۔ اگر حمد و نعت میں کہے ہوئے اشعار ہی سے کسی شخص کا صاحبِ ایمان و اسلام ہونا ثابت ہو جاتا ہے تو ان بیسیوں ہندو اور غیر مسلم شاعروں کے متعلق کیا ارشاد ہے جن کے کلام میں حمد و نعت کے پُر اثر نمونے خلوص و جوش سے لبریز اور شعری لطافتوں اور نزاکتوں کے حامل مضامین ملتے ہیں؟

ان سطور سے "رودِ کوثر" کی تاویلوں کا محاکمہ مقصود نہیں — بلکہ شیخ مبارک کے گھرانے نے اسلام اور مسلمانوں کے اس دورِ ابتلا میں جو کردار ادا کیا، اسے اُجاگر کرنا مقصود ہے جس پر ان سب لوگوں نے پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے جو اسلامی معاشرہ کے اندر اٹھنے والے ہر فتنے کی تاویل اور اس کا دفاع اپنا علمی فرض سمجھتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمان اس نوعیت کے فتنوں کے خلاف صف آرا ہونے کے بجائے ان

(حاشیہ از صفحہ گزشتہ) اس نے تفسیرِ بے نقط اپنی بدنامی کو، جو قیامت تک سیکڑوں دریاؤں کے پانی سے نہیں دھوئی جا سکتی، دھونے کے لیے لکھی تھی اور وہ بھی عینِ مستی اور جنابت کی حالت میں لکھی تھی (اس کے پالتو) کتے اس تفسیر کے اوراق کو پامال کرتے رہتے تھے۔"

کے ساتھ مداہنت برتیں اور ان کو اپنے درمیان پنپنے اور پلنے بڑھنے دیں۔

سنہ ۱۰۰۴ھ میں فیضی کا انتقال ہوا۔ اکبر کو خبر ملی کہ اس کا عزیز محبوب دوست عالم نزع میں ہے۔ شاہی حکیم لے کر آدھی رات کے وقت اس کے گھر پہنچا۔ اس کا سر پکڑ کر بولا "شیخ جیو، بولو، حکیم علی کو ساتھ لے کر آیا ہوں، آخر تم بولتے کیوں نہیں ہو؟" مگر فیضی کی زبان بند ہو چکی تھی اور ہوش و حواس جاتے رہے تھے۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اکبر نے پھر جھنجھوڑا، مگر اب اس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ سخت اضطراب اور رنج والم کے عالم میں اکبر نے اپنی پگڑی اتار کر زمین پر پھینک دی۔

بدایونی لکھتے ہیں:

"بادشاہ جب پہنچے تو اس کا آخری وقت تھا۔ انہیں دیکھ کر کُتّوں کی طرح بھونکنے لگا۔ یہ واقعہ خود بادشاہ نے اس کے دیوان پر لکھا ہے۔ مرتے وقت اس کا چہرہ سوج گیا تھا اور ہونٹ سیاہ پڑ گئے تھے۔ بادشاہ نے شیخ ابوالفضل سے پوچھا "اس کے لبوں پر اتنی سیاہی کیوں ہے؟ کیا شیخ نے مسّی لگا رکھی ہے؟" ابوالفضل نے کہا۔ "نہیں خون قے میں نکلا تھا اور جم گیا ہے"۔ اس ناپاک بدبخت اور حضورِ اکرم ؐ پر طعنہ زنی کرنے والے کا یہی حشر ہونا چاہیئے تھا اور یہ بھی کم تھا۔"

فیضی کے مرنے پر بہت سے لوگوں نے تاریخیں کہیں۔ ان تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ خود اس زمانے میں اس کے کردار اور دین و ایمان کا کیسا شہرہ تھا۔ ایک نے کہا:

فیضیؔ بے دین چو مرد سال وفاتش
گفت سگے از جہاں رفتہ بحال قبیح

ایک اور نے کہا:

فیضیؔ نجس دشمنِ نبوی ——— رفت و با خویش داغ لعنت بُرد
سگگی بود و زخی زاں شد ——— سال فوتش چو سگ پرستی مرد

اسی طرح ایک تاریخ ہے ——— "قاعدۂ الحاد شکست"۔

ایک اور تاریخ ہے ——— "دے فلسفی وشیعی وطبیعی ودہری"۔

فیضی کی قابلیت، لیاقت، دقتِ نظر اور جودتِ طبع کا ہر شخص معترف رہا ہے۔ بدایونی کی رائے اگرچہ اس کی شاعری کے متعلق کچھ اچھی نہیں؛ تاہم انہوں نے اس کے علم وفضل کو خراجِ تحسین پیش کرنے سے دریغ نہیں کیا ہے۔ ایک جگہ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"در فنونِ جزئیہ از شعر ومعمّا وعروض وقافیہ، تاریخ ولغت وطب وانشاء عدیل در روزگار نداشت۔"

مختلف فنون، شعر، معمّا، عروض وقافیہ، تاریخ ولغت اور طب وانشا میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اس کی مثنوی نلدمن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"امیر خسرو کے بعد تین سو سال کے عرصے میں ایسی عمدہ مثنوی ہندوستان میں کسی نے نہیں لکھی"۔

مآثر الامراء کا مصنف لکھتا ہے:

"بدقتِ طبع وجودتِ ذہن از جمیع علوم بخشی وافر برداشتہ در حکمت وعربیت بیشتر تتبع نمودہ وبزشکی دانش فرا گرفتہ رنجورانِ تہی دست را چارہ می کرد۔"

مولانا شبلی شعر العجم حصہ سوم میں لکھتے ہیں:

"فارسی شاعری نے چھ سو برس کی وسیع مدت میں ہندوستان میں صرف دو شخص پیدا کیے جنہیں اہلِ زبان کو بھی چار و ناچار ماننا پڑا۔ خسرو اور فیضی ..... فیضی کی خصوصیات میں سب سے بڑھ کر جوشِ بیان ہے جس کا وہ موجد بھی ہے اور خاتم بھی۔ جوشِ بیان خواجہ حافظ میں بھی ہے اور اعلیٰ درجہ پر ہے، لیکن رندانہ مضامین اور دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ مخصوص۔ فیضی کے ہاں فخریہ، عشقیہ، فلسفیانہ ہر قسم کے مضامین میں وہی جوش پایا جاتا ہے۔ جوشِ بیان اس کے ذاتی حالات کا خاص اثر ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتا تھا"۔

ق

۲۷- قلیج خان اندجانی

اندجان کا باشندہ تھا۔ اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا اور امرائے دربار میں جگہ پائی۔ سلطنت کی مختلف خدمات سپرد کی گئیں، جنہیں بخوبی انجام دینے کے عوض جاگیریں حاصل کیں اور اعلیٰ مناصب پر سرفراز ہوا۔ شہزادہ دانیال کا خسر اور اتالیق تھا۔ اکبری عہد کے سربرآوردہ اور با اثر امراء میں شمار ہوتا تھا۔ نہایت متدیّن اور حق گو تھا۔ متبحّر عالم تھا۔ اکبر کے آخری ایام میں پنجاب کا گورنر تھا۔ مآثر الامراء جلد سوم میں لکھا ہے:

"قلیج خان بہت صاحبِ صلاح و تقویٰ تھا۔ متعصّب سنّی تھا۔ پنجاب کا گورنر ہونے کے باوجود طلبہ کو درس دیتا تھا۔ اپنے ذاتی مصارف سے ایک دینی مدرسہ بھی جاری کر رکھا تھا، جہاں فقہ اور تفسیر و حدیث کی تعلیم ہوتی تھی۔ اس مدرسے میں خود روزانہ تین گھنٹے درس دیا کرتا تھا۔ علومِ شریعت کی ترویج و اشاعت میں بے حد کوشاں رہتا تھا۔ لاہور کے لوگ امّیدِ روشناسی اور حصولِ مقاصد کے لیے ان علوم کی تحصیل میں نہایت دلچسپی لینے لگے تھے۔"

اس نے اپنے صوبے میں پرتگیزی مشنریوں سے وہ تمام مراعات واپس لے لی تھیں جو اکبر نے انہیں دی تھیں۔ اپنی عملداری میں احکامِ شریعت کی ترویج و نفاذ کا اہتمام خاص کرتا تھا۔ شاعر بھی تھا اور الفتی اس کا تخلّص تھا۔ یہ رباعی اس کی یادگار ہے:

عاشق ہوسِ وصال در سر دارد
صوفی زرقے زخرقہ در بر دارد
من بندۂ آں کسم کہ فارغ ز ہمہ
دایم دلِ گرم و دیدۂ تر دارد

ل

۲۸- لالہ بیگ

باز بہادر لقب تھا۔ جہانگیر کے اکابر امراء میں سے تھا۔ بنگال کی صوبہ داری پر فائز رہا۔ سنہ ۱۰۱۶ھ میں وفات پائی۔

"اقبال نامہ" کا مصنّف میرزا محمّد معتمد خاں بخشی لکھتا ہے:

"جہانگیر قلی خاں میرزا محمد حکیم کے غلام زادوں میں سے تھا۔ پہلے لوگ لالہ بیگ کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ میرزا کا انتقال ہوگیا تو حضرت عرش آشیانی (اکبر) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جہاں پناہ نے اپنے فرزند بلند اقبال شہنشاہ (جہانگیر) کو عنایت کر دیا۔ بڑا ہی قوی ہیکل تھا۔ صاحب نظر اور اسلامی جوش و جذبہ سے بہرہ مند اور حق پرست تھا۔ ہمیشہ اچھے اور پسندیدہ کام سرانجام دیتا تھا"۔

مآثر الامراء میں ہے:

"بہ دین داری و حق پرستی شہرۂ تمام داشت و در احتراز مثنویات بسیار می کوشید"۔

م

۲۹ - مُلّا مبارک ناگوری

ابوالفضل اور فیضی کے پدرِ "نامدار"۔ ناگور (نزد اجمیر) کے رہنے والے تھے۔ گجرات میں خطیب ابوالفضل اور مولانا عمادی طاری سے علوم و فنون کی تکمیل کی تحصیلِ علم کے بعد آگرہ میں قیام کیا اور مسندِ درس و وعظ بچھائی۔ بڑے ذکی و فہیم تھے۔ قرآن و حدیث اور فقہ پر گہری نظر تھی۔ علومِ عقلیہ میں بھی گہرا درک رکھتے تھے۔ شعر و سخن، معمّہ گوئی اور دیگر فنون میں بھی بڑی دسترس تھی۔ تصوّف پر بھی عبور حاصل تھا۔ بلا کا حافظہ پایا تھا۔ شاطبی پوری یاد تھی۔ قرآن مجید کی سات قرأتوں کے حافظ اور قاری تھے۔ قرآن کریم کی ایک تفسیر چار جلدوں میں منبع نفائس العیون کے نام سے لکھی۔

شیخ کی ابتدائی زندگی ریاضت، مجاہدے، صلاح و تقویٰ اور توکّل سے عبارت تھی۔ دنیا پرستی اور دنیا داری سے سخت متنفّر تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا خیال ہر وقت دامنگیر رہتا تھا اور چھوٹے چھوٹے امور میں بھی بڑے متشدد تھے۔ اپنی مجلسِ وعظ میں کسی کو سونے کی انگشتری، ریشم، سرخ موزے یا سرخ و زرد کپڑے پہنے دیکھ لیتے تو اسی وقت اتار دینے کا حکم دیتے۔ جس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے ہوتا، اسے پھاڑ دینے کی تاکید کرتے۔ اگر راستے میں کسی جگہ نغمہ و سرود کی صدا کانوں میں پڑ جاتی تو تیز تیز قدم اٹھا کر وہاں سے نکل جاتے، لیکن یہی شیخ مبارک آخری عمر میں حُبِّ دنیا اور حُبِّ جاہ کے نشے میں چُور اکبر کے دربار سے وابستہ اور اس کے الحاد و بے دینی کو شرعی جواز عطا کرتے نظر آتے ہیں۔ زہد و ورع اور درویشی و توکّل کی جگہ زمانہ سازی اور جہاں فریبی لے لیتی ہے۔ ساز و سرود سے لطف اندوز ہوئے بغیر

چین نہیں آتا۔

شیخ کی زندگی میں اس انقلاب کا بنیادی سبب یہ تھا کہ بایں ہمہ علم و کمال طبیعت میں ثبات و استقلال نہ تھا۔ کسی ایک مسلک اور طریقے کے ساتھ ان سے وابستہ نہ رہا جاتا تھا۔ مزید یہ کہ انتہا پسند تھے۔ جس طرف جھکتے تھے غلو کی حد تک جھکتے تھے۔ ابتدا میں حنفی مسلک رکھتے تھے۔ پھر تقلید کی زنجیریں کاٹ کر آزاد ہوئے ہیں تو ان کا رہوار فکر تجدد کی راہوں میں پہنچ گیا۔ کچھ عرصے تک شیخ علائی کے ساتھ رہے اور جامد و تنگ نظر اور مہدوی دشمن علماء کے غضب کا ہدف رہے۔ عہد اکبری میں نقشبندی صوفیاء کو عروج و اقتدار حاصل ہوا تو اس سلسلے سے وابستہ ہو گئے۔ کچھ عرصے تک ہمدانی مشائخ کے حلقے سے بھی متعلق رہے۔ آخر میں جب عراقیوں کو اقتدار حاصل ہوا تو انہی کے ہم نوا و ہم رنگ ہو گئے۔ بقول بدایونی تکلموا الناس علیٰ قدرِ عقولِہِم (لوگوں سے ان کی عقل و دانش کے مطابق باتیں کیا کرو) پر ان کا عمل تھا۔ ان کی اس تلوّن مزاجی کی بنا پر کبھی انہیں مہدوی کہا گیا کبھی رفض و تشیّع سے متہم کیا گیا۔ جن دنوں مخدوم الملک مُلّا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنّبی نے اہلِ بدعت اور رافضیوں کی دار و گیر کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا بادشاہ کی اجازت سے شیخ مبارک کو بھی محتسب بھیج کر طلب کیا گیا۔ شیخ اپنے بیٹوں کو لے کر رُوپوش ہو گئے۔ عوام الناس کو ان کے خلاف اس حد تک برانگیختہ کر دیا گیا تھا کہ انہوں نے ان کی مسجد کا منبر توڑ ڈالا۔ مدتوں چھپتے چھپاتے پھرے۔ شیخ سلیم چشتیؒ ان دنوں بادشاہ کے پیر و مرشد تسلیم کئے جاتے تھے۔ شیخ مبارک نے انہیں وسیلۂ سفارش بنانا چاہا۔ شیخ سلیم خوب جانتے تھے بادشاہ عقیدت مند سہی، مگر مخدوم الملک اور صدر الصّدور کے آگے ان کی کچھ نہ چلے گی اور ان سے تصادم کے معنی اپنی شامت آپ بلوانے کے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک مرید کے ہاتھ مصارفِ سفر کے لیے کچھ رقم بھیجی اور کہلوایا بہتر یہی ہے کہ تم اس ملک سے بھاگ کر گجرات چلے جاؤ۔ شیخ سلیم

سے مایوس ہو کر شیخ مبارک نے خان اعظم مرزا عزیز کوکہ کو وسیلہ بنایا۔ مرزا نے بادشاہ سے شیخ کے علم وفضل درویشی اور زہد و ورع کی بڑی تعریف کی۔ ان کے بیٹوں کی علمیت کا تذکرہ بھی کیا اور کہا انہیں سرکار کی طرف سے کوئی زمین وغیرہ بھی نہیں ملی —— متوکّل انسان ہیں، ایسے مردِ درویش کو آزار پہنچانا نامناسب ہے۔ کوکہ کی سفارش کارگر ہوئی۔ شیخ اور ان کے بیٹوں کو امن اور چین نصیب ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد مُلّا مبارک اور ان کے بیٹے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ پھر وہ عروج پایا کہ باید و شاید۔ انہوں نے اکبر کے ذہنی بگاڑ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور نہ صرف مخدوم الملک اور صدر الصّدور سے بلکہ اسلام سے بھی انتقام لیا، جس کے وہ بزعمِ خویش نمائندہ تھے اور جس کے نام پر انہوں نے ان باپ بیٹوں کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔

آخر عمر میں بینائی کمزور ہو گئی تھی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی —— اسی زمانے میں انہوں نے اپنی تفسیر لکھی —— شیخ نے ۱۰۰۱ھ میں لاہور میں انتقال کیا۔ بدایونی لکھتے ہیں:

"بلاشبہ ایسا جامعِ کمال عالم پھر نظر نہیں آیا۔ لیکن افسوس حُبِّ دنیا اور حُبِّ جاہ نے انہیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ لباس تو درویشانہ تھا، لیکن درحقیقت اسلام سے کوئی علاقہ نہ رہا تھا۔"

ان کے بیٹوں نے تعزیت میں ہندوانہ رواج کے مطابق بھدرا کروایا، یعنی اپنے سر کے بال، داڑھی مونچھیں اور ابرو منڈوا دیئے۔ فیضی نے تاریخ وفات "فخر المکمل" نکالی۔

۳۰۔ شیخ محمد سعیدؒ

حضرت مجددؒ کے دوسرے فرزند ہیں۔ شعبان المعظم ۱۰۰۵ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ خواجہ محمد معصومؒ آپ کے متعلق ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"چھوٹی عمر ہی سے قبول و کرامت کے آثار اور ولایت و نجابت کے اطوار نمایاں

تھے۔ حضرت قطب الولایت خواجہ باقی باللہؒ کی زندگی میں یہ خورد سال تھے اور حضرت خواجہ کی ظاہری ملازمت میں نہیں پہنچے تھے، لیکن حضرت خواجہ نے ان کے بارے میں فرمایا تھا کہ محمد سعید حریف ہے ہم سے غائبانہ نسبت لے گیا ہے۔

کمالاتِ ظاہری و باطنی اپنے والدِ بزرگوار سے حاصل کئے اور سترہ برس کی عمر میں علومِ ظاہری معقول و منقول میں تکمیل کی۔ اپنے والدِ بزرگوار کی طرح تشریح و تقویٰ اتباعِ سُنّت اور عزیمت سے بدرجۂ کمال آراستہ و پیراستہ تھے۔ گفتگو نہایت نرم ہوتی تھی، تواضع اور انکسار کا مجسّمہ تھے۔ مہمانوں کی خاطر مدارات میں بڑا اہتمام کرتے، جو کچھ موجود ہوتا تھا خرچ کر دیتے ــــ اپنی ہستی کی نفی ان کا طریقۂ حسنہ تھا۔ سندِ عالی کے ساتھ قرآن مجید کی تجوید فرمائی۔ حدیثِ نبوی میں سندِ جیّد اور اعلیٰ مرتبے کے حامل تھے۔ فقہ میں مکمل دستگاہ رکھتے تھے۔ ہمارے حضرت کو اکثر مسائلِ فقہ کی تحقیق کی ضرورت پڑتی تھی، چنانچہ ان سے دریافت فرمایا کرتے تھے...... حضرت کے سامنے ہی مرتبۂ کمال کو پہنچے اور خلافت سے مشرف تھے۔"

اورنگ زیب عالمگیر ان کا بے حد عقیدت مند تھا۔ ۲ جمادی الآخر ۱۰۷۰ھ کو وفات پائی۔

۱۳۱- شیخ محمد معصومؒ

حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے صاحبزادے اور دوسرے خلیفہ ہیں۔ عروۃ الوثقیٰ لقب تھا اور قیوم ثانی خلافتِ سلسلۂ مجدّدیہ میں ان کا مقام۔ ۱۰ شوال ۱۰۰۷ھ ہجری میں تاریخِ ولادت ہے۔ حضرت مجدّد ان کی ولادت کو بے حد باعثِ برکت خیال کرتے تھے کہ چند ماہ بعد خواجہ باقی باللہؒ کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ اکثر علوم اپنے والدِ بزرگوار سے اپنے

بڑے بھائی خواجہ محمد صادق اور شیخ محمد طاہر لاہوری سے پڑھے۔ بچپن ہی سے آثارِ سعادت عیاں تھے۔ یکم ربیع الاول ۱۰۳۴ھ کو مسندِ ارشاد و قیومیت پر متمکن ہوئے۔ آپ کے مرید برِصغیر ہی میں نہیں بیرونی ممالک خراسان، ماوراء النہر، توران، طبرستان، بدخشان، ترکستان، بدخشان، کاشغر وغیرہ تک پھیلے ہوئے تھے جن میں اپنے وقت کے بڑے بڑے مشائخ اور شہزادے اور سلاطین شامل تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر بھی آپ کا معتقد تھا۔ صرف خلفاء کی تعداد سات ہزار تک پہنچتی ہے۔ فرحت الناظرین میں ہے:

"اپنے والدِ بزرگوار شیخ احمد کے مرید اور خلیفہ تھے۔ مریدوں کی تربیت اور ان کے احوال و وقائع کی تعبیر اور مشکلات کے حل میں اپنے بھائیوں اور اپنے عہد کے سارے شیوخ سے امتیازی شان رکھتے تھے۔ آپ کی تصنیفات مکتوبات کی تین جلدیں ہیں جن میں عجیب و غریب اسرار و نکات اور نادر علوم بیان کئے گئے ہیں۔ بادشاہ دین پناہ اورنگ زیب کی استدعا پر متعدد بار محل میں تشریف لے گئے جہاں بادشاہ خصوصی تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔"

۹ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ کو انتقال فرمایا اور سرہند میں مدفون ہوئے۔

۳۲- میر محمد نعمان بدخشی

۹۹۷ھ میں سمرقند میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں برِصغیر پاکستان و ہند میں آئے۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے بیعت کی۔ خواجہ صاحب نے وفات کے وقت انہیں حضرت مجدد کے سپرد کیا۔ انہوں نے انہیں خلعتِ خلافت دیا اور اصلاح و ارشاد کے لیے برہان پور بھیجا۔ برہان پور اس زمانے میں ایک بہت بڑا شہر تھا اور علوم و فنون کا مرکز اور علماء و صلحاء کا مسکن تھا۔ میر نعمان مدت تک برہان پور میں مقیم رہے۔ پھر آگرے سے تشریف لے گئے اور وہیں ۱۰۵۸ھ میں انتقال کیا۔

حضرتِ مجدّدؒ کے نامور خلفا میں سے تھے۔ حضرت نے اپنے بہت سے مکاتیب میں انہیں مخاطب کیا ہے۔ جن میں سے بعض میں اسلام کی بے بسی پر نوحہ زنی اور بادشاہ کی بے حسی اور کفر دوستی پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"شریعت کی ترقی کا انحصار بادشاہوں کے حُسنِ انتظام پر ہے۔ جب سے بادشاہوں نے ترویجِ شریعت سے تغافل برتا ہے، اسلام بے بس ہو کر رہ گیا ہے۔ ہندوستان کے کفّار بے تحاشا مسجدیں گرا کر مندر تعمیر کر رہے ہیں۔ کچھ عرصہ پیشتر تھانیسر میں ایک مسجد اور ایک بزرگ کا مقبرہ مسمار کر کے ایک بہت بڑا مندر تعمیر کیا گیا۔ نیز کفّار اپنے مذہبی مراسم کھلم کھلا انجام دیتے ہیں، مگر مسلمان احکامِ شرعی نافذ کرنے سے قاصر ہیں۔ ہندو ایکاؤشی کے دن کھانا پینا ترک کر دیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اُس روز کوئی مسلمان نہ روٹی پکائے نہ بیچے۔ خود ماہِ رمضان میں برملا نان و طعام پکاتے اور بیچتے ہیں، مگر اسلام کے مغلوب ہونے کی بنا پر کوئی روک نہیں سکتا۔ ہائے افسوس! بادشاہِ وقت ہم میں سے ہو اور ہم فقیریوں خستہ اور زبوں حال ہوں"۔

۳۳۔ خواجہ معین الدّین چشتیؒ

حسینی و حسنی سادات میں سے ہیں۔ باپ کا نام غیاث الدّین حسن تھا۔ سجستان میں جسے سیستان بھی کہتے ہیں، پیدا ہوئے۔ اسی نسبت سے آپ کو سجزی بھی کہتے ہیں۔ جسے غلط فہمی سے سنجری سمجھ لیا گیا۔ پہلے بخارا اور پھر خراسان میں علومِ ظاہری کی تکمیل کی۔ باپ کی وفات پر پندرہ برس کی عمر میں ہارون آئے۔ ہارون (ہرون) نیشاپور کے نواح میں ایک قصبہ ہے۔ یہاں خواجہ عثمان چشتی کے مرید ہوئے اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ اپنے شیخ کے حکم سے ہمیشہ سفر میں رہتے تھے۔ طبقاتِ ناصری کے مصنّف

قاضی منہاج الدین عثمان جوزجانی کے بیان کے مطابق حضرت خواجہؒ سلطان شہاب الدّین غوری کے اس لشکر کے ساتھ تھے، جس نے رائے پتھورا (پرتھوی راج) کو شکست دے کر دہلی فتح کیا تھا اور اس فتح میں ان کی دعاؤں اور فیوض و برکات کا بڑا حصہ تھا، لیکن بعض سیرت نگاروں کے خیال میں حضرت خواجہؒ دہلی کی فتح سے پہلے ہی قدیم ہندوستان کے دارالسّلطنت اجمیر میں مقیم ہو گئے تھے اور کفر کی تاریکیوں میں چراغِ ایمان و توحید روشن کر دیا تھا۔ بہر حال صورتِ واقعہ کچھ بھی ہو، حضرت خواجہ ہی کی طفیل ہندوستان میں اسلام کا چراغ روشن ہوا۔ سیرالاولیاء کے مصنّف لکھتے ہیں:

"مملکتِ ہندوستان تا حدِ بر آمدنِ آفتاب ہمہ دیارِ کفر و کافری و بت پرستی بود، و متمردانِ ہندھر یکے دعوئے انا ربکم الاعلیٰ می کردند و خدائے را جل و علا شریک می گفتند و سنگ و کلوخے و دار و درخت و ستور و گاؤ و سرگین آں را سجدہ می کردند و بظلمتِ کفر قفل دل ایشاں مظلم و محکم بود .... وصول قدم مبارک آں آفتابِ اہلِ یقین کہ بہ حقیقت معین الدین بود ظلمتِ ایں دیار بنور اسلام روشن و منور گشت......."

"ملک ہندوستان اپنے آخری مغربی کنارے تک کفر و شرک کی بستی تھی۔ متمرّدین" انا ربکم الاعلیٰ" کا دعویٰ کر رہے تھے اور دوسری ہستیوں کو خدائے بزرگ و برتر کا شریک ٹھہراتے تھے۔ اینٹ، پتھر، درخت، جانور، گائے اور گوبر کو سجدہ کرتے تھے۔ کفر کی ظلمت سے ان کے دل تاریک اور مقفّل تھے ...... حضرت خواجہ معین الدّین کے قدم مبارک اس ملک میں پہنچے تو اس کی ظلمت اسلام کے نور سے روشن و منور ہو گئی۔"

ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام سے مرکزیت اجمیر سے دہلی منتقل ہو گئی حضرت خواجہؒ نے خود اجمیر ہی میں مقیم رہ کر ارشاد و تلقین کا سلسلہ جاری رکھا اور

دہلی میں رشد و ہدایت کے لیے اپنے خلیفہ حضرت قطب الدّین بختیار کاکیؒ کو متعیّن فرمایا۔ ۶۲۷ھ میں نوّے سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اس وقت سلطان شمس الدّین التمش سریر آرائے حکومت تھا۔ حضرت خواجہ سلسلۂ چشتیہ کے برِصغیر میں پہلے شیخ تھے۔ انہی سے آگے یہ سلسلہ پھیلا اور بڑے بڑے شیوخ پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے حضرت خواجہ شیخ الشیوّخ کہلاتے ہیں۔

۵

۳۴- ہمایوں

نصیر الدّین ہمایوں مغلیہ خانوادے کا دوسرا بادشاہ تھا۔ بابر کا سب سے بڑا بیٹا اور اکبر کا باپ۔ ۹۱۳ھ (مارچ ۱۵۰۸ء) میں کابل میں پیدا ہوا۔ بڑا بہادر اور مستقل مزاج تھا۔ حالات چاہے کتنے ہی مایوس کن کیوں نہ ہوتے ہمّت و حوصلہ نہ ہارتا تھا۔ صاحب عزیمت تھا۔ بابر اپنے پیچھے جو سلطنت چھوڑ گیا تھا، وہ اس کے ہاتھوں سے نکل گئی، ادھر بھائیوں نے بھی دغا دیا، ہمایوں مدّتوں ٹھوکریں کھاتا پھرا، شکستوں پر شکستیں کھائیں، بھائیوں کے ہاتھوں زخم اٹھائے، اس کے باوجود اس کے دم خم میں فرق نہ آیا۔ آخر کار اس نے کھوئی ہوئی سلطنت واپس لے لی۔ بحیثیتِ حکمران اس میں بہت سی خامیاں تھیں۔ وہ کامیاب جرنیل بھی نہ تھا؛ تاہم وہ اپنے عزم و استقلال اور جرأت و ہمّت کی بدولت سرزمینِ ہند میں اپنے خاندان کے اکھڑے ہوئے قدم از سرِ نو مستحکم کر گیا۔

ہمایوں عالم و فاضل بادشاہ تھا۔ ترکی، عربی اور فارسی میں مہارت رکھتا تھا۔ ریاضی، علمِ ہیئت، فلسفہ اور نجوم کا بھی ماہر عالم تھا۔ اس کے علاوہ بلند پایہ شاعر تھا۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں ہمایوں کے ذوقِ شعری کو خراجِ تحسین ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

> "شعر و شاعری کی طرف بھی توجہِ عالی رکھتے ہیں۔ چونکہ موزونیٔ طبع فطرتِ سلیم کی خصوصیات میں سے ہے، فراغت کے اوقات میں وارداتِ قلب کو خواہ حقیقت سے تعلّق رکھتے ہوں یا مجاز سے، نظم کی سلکِ مروارید میں پروتے ہیں۔ حضرتِ والا کا شعری دیوان کتاب خانۂ عالی میں موجود ہے۔"

ہمایوں کی شاعری میں سلاست و شگفتگی پائی جاتی ہے۔ جن دنوں غربت کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا، تبریز کی سیر کو گیا، وہاں پرانے زمانے کے خرابوں اور آثار کو دیکھ کر بھی

متاثر ہوا اور یہ رباعی کہی :

افسوس کہ سرمایہ بکف بیروں شد
در دستِ اجل بے جگرہ باخوں شد
کس نامد ازاں جہاں کہ تا پرسم ازو
کاحوال مسافرانِ عالم چوں شد

قلعہ قندھار کی فتح پر ایک نظم کہی اور بیرم خاں کو بھیجی جس کی بہادری اور تدبیر سے یہ فتح حاصل ہوئی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

باز فتح زغیب روئے نمود
کہ دلِ دوستاں از بکشود
شکر اللہ کہ باز شادیم
بررخِ یار و دوست خندانیم
دوستاں را بکام دل دیدیم
میوۂ باغِ فتح را چیدیم
روزِ نو روز بیرم است امروز
دلِ احباب بے غم است امروز

وفات کے قریب یہ رباعی کہی :

یارب بکمال لطف خاصم گرداں
واقف بحقائق خواصم گرداں
از عقلِ جفاکار دل افگار شدم
دیوانۂ خود خوان و خلاصم گرداں

ایک اور رباعی ہے :

اے دل ز حضورِ یار فیروزی کن — در خدمتِ او بجہد دلسوزی کن
ہر شب بخیالِ دوست خرم بنشیں — ہر روز بوصلِ یار نوروزی کن

ایک غزل ہے:

کارِ من با مہوشے افتادہ است — در درونم آتشے افتادہ است
خانہ ام روشن شد از روئے حبیب — پرتوے ز مہوشے افتادہ است
دل مرا اے جاں بہر سو می کشد — تا دلم با دلکشے افتادہ است
کامِ دل خواہم گرفتن ایں زماں — چوں بدستم مہر خوشے افتادہ است
عقل و ہوش از من جوئید اے بتاں — چوں ہمایوں بیہشے افتادہ است

ی

۳۵ - قاضی یعقوب مانکپوری

فقہ اور اصول کے عالم کامل تھے۔ نہایت خوش مزاج اور شگفتہ بیان تھے۔ مزاحاً عربی کے شعر ہندی بحروں میں کہا کرتے تھے۔ اکبر نے انہیں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز کیا، پھر معزول کر کے بنگال کا قاضی بنا دیا۔ انہوں نے بھی فتویٰ دیا کہ اکبر کافر ہو گیا ہے۔ پھر جب اکبر کے خلاف شورش اٹھی اور معصوم خان کابلی نے علمِ بغاوت بلند کیا تو قاضی یعقوب نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ انہیں گرفتار کر کے گوالیار بھیجا گیا اور میر معزّالملک اور ملا یزدی کی طرح انہیں بھی راستے ہی میں ختم کر دیا گیا۔